Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1970

اس پرچہ میں

رزق کی محمدی تقسیم

(معاشی مسئلہ کا اسلامی حل)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰ — خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ: پاکستان — ایک روپیہ؛ ہندوستان — ڈیڑھ روپیہ	بدلِ اشتراک: سالانہ پاکستان — دس روپے؛ سالانہ ہندوستان — پندرہ روپے؛ سالانہ غیر ممالک — ایک پونڈ

نمبر (۶)	جون ۱۹۷۰ء	جلد (۲۳)

فہرست

(۱) لمعات — ۲

(۲) طلوعِ اسلام کالج فنڈ — (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) — ۱۶

(۳) رزق کی مصری تقسیم — (محترم پرویز صاحب) — ۱۷

(۴) علمائے کرام ۔ امام غزالیؒ کی نگاہوں میں — (محترم رفیع اللہ صاحب) — ۴۱

(۵) باب المراسلات — (ختمِ نبوت) — (مودودی صاحب اور صحابہ کبارؓ) — (راستے میں اخلاقیات اور قرآن) — ۵۷

(۶) حقائق و عبر — (الیکشن کی برکات) — ۶۹

(۷) عورتوں کے اسلامی حقوق اور نابالغ لڑکیوں کی شادی — (شاہد عادل) — ۷۲

(۸) نقد و نظر — ۷۹

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور، بہ نظر شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشنوں میں شریک ہونے والے احباب نے "ایک جواں سال، جواں ہمت، جواں بخت، جوانِ رعنا، کو دیکھا ہوگا جس کی چمکتی ہوئی پیشانی سے اس کا خلوص اور دمکتے ہوئے چہرے سے اس کی محبت چھلک چھلک پڑتی اور ہر دیکھنے والے کو مسحور کر جاتی تھی۔ وہ ہر مہمان کی آواز پر لبیک کہتا، لپک کر اس کی طرف جاتا، انتہائی مستعدی سے ہر خدمت سرانجام دیتا اور شگفتہ و شادابی مسکراہٹوں سے جو اس کی زندگی کا جزوِ دین چکی تھیں، ہر ایک کا دل موہ لیتا۔ وہ صرف کنونشنوں کے اجتماعات ہی میں باعثِ گرمیٔ محفل نہ ہوتا بلکہ ہر قرآنی اجتماع میں اس کی باغ و بہار شخصیت وجہ تازگیٔ مجلس بنتی۔ سالہاسال سے اس کا یہ التزام تھا کہ وہ اپنے دفتری کام کاج سے فارغ ہو کر، ہر شام ادارہ میں آجاتا، اور گئی رات تک مختلف کاموں میں رفقاء کا ہاتھ بٹاتا۔ نہ کبھی خود آزردہ ہوتا، نہ یارانِ محفل کو افسردہ ہونے دیتا۔

یہ تھا جواں سال، جواں ہمت، بلند اقبال جو ایک شام تندرست و توانا سویا اور آدھی رات کے قریب، دو ہچکیاں لے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ۔۔ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔

میرے دل کا زخم جو ندیمِ قدیم، عبدالحکیم خان کی ناگہانی موت کے ہاتھوں لگا تھا، ہنوز مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ اب اس صدمۂ جانکاہ نے میرے جگر کے ٹکڑے کر دیئے ۔۔۔ بلند اقبال! میں خستہ جان دکا میدہ لب، اس کے سوا کیا کہوں کہ ۔۔۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور! تم ہی کہو کہ میں عزیزہ بیٹی مجیدہ اور محترمہ بہن بلند اختر سے کس طرح کہوں کہ وہ اپنے آنسوؤں کو تھام لیں، اور ہر شام تمہارے انتظار میں بیٹھے رہنے والے تمہارے رفقاء کو کیسے سمجھاؤں کہ تم اب نہیں آؤ گے ۔۔۔ کبھی نہیں آؤ گے!

تم قرآن کے شیدائی تھے۔ قرآن کا خدا تمہیں اپنے سحابِ کرم سے نوازے!

تمہیں نہ بھول سکنے والا

تمہارا بابا جی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مندرجہ ذیل خط کا بغور مطالعہ فرمایئے۔

ماہِ رواں کے طلوعِ اسلام میں حقائق و عبر کے تحت تسہیر عنوان آپ نے (اسلام کی تعلیم یہ نہیں) قائم فرمایا ہے جس میں مولانا بھاشانی سے انٹرویو کے دوران کئے گئے سوالات و جوابات درج ہیں۔

مولانا تشدد و گھیراؤ کو خلافِ اسلام تصور نہیں کرتے طلوعِ اسلام نے بھی ظالم و غاصب کے سر کچلنے کی دبی زبان میں حمایت کی ہے مگر جبر و تشدد کا استیصال اسلامی اصول کے تحت طلوعِ اسلام نے حکومت کا ذمہ قرار دیا ہے۔

آپ کا یہ فیصلہ مکمل اسلامی حکومت کی موجودگی میں تو درست تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر جب حکومت مکمل قرآنی نظام کے مطابق نہ ہو اور حکمران طبقہ لادینیت کا شکار ہو چکنے کے سبب ظلم و تشدد کی فراخدلانہ طریقے پر حمایت و تائید بھی کر رہا ہو، پھر ظالم و غاصب کے خلاف حکومتِ وقت کیونکر نبرد آزما ہو سکتی ہے۔ نہ اسلامی حکومت بنے نہ ہی جبر و استبداد کا خاتمہ ہو۔ اور مجبور و مظلوم طبقہ آہ و فغاں کئے بغیر خاموشی سے نشانۂ ستم بنا رہے۔ یہ تسلیم کہ افراد کو تشدد و گھیراؤ کا حق نہیں دیا جا سکتا لیکن جب حکومتِ وقت کا مجبور و مظلوم انسانوں کی توقعات پر پورا اترنے کا کوئی امکان ہی نظر نہ آئے تو پھر ستم رسیدہ انسانیت کس سایۂ عاطفت میں پناہ لے؟

میان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

میرا ایمان ہے کہ اسلام نے ایسے حالات کا بھی یقیناً کوئی حل ضرور پیش کیا ہوگا۔ مولانا بھاشانی

نے اس کا حل تلاش کرلیا ہے مگر آپ کی دوررس عقابی نگاہ اس مسئلے میں کیوں دقیانوسی ملائیت کا شکار ہوگئی ہے ؟

ازرہ کرم آئندہ شمارے میں اس مسئلہ پر ضرور قلم اٹھایئے ورنہ میں آپ کی فہم و بصیرت پر ضرور تشویش میں مبتلا ہو جاؤں گا۔"

یہ خط کسی ایک فرد کے خیالات کا مظہر نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس ذہنیت کا جو آجکل ہماری قوم کے نوجوانوں میں بالعموم پرورش پارہی اور تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے نہ صرف اس خط کو شائع کیا ہے بلکہ اسے اشاعتِ حاضرہ کے لمعات کا موضوع بھی قرار دیا ہے۔ یہ سوال ایسا ہے جس پر ملک کے ہر صاحبِ بصیرت دردمندِ ملت کو نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیئے۔ آیئے ہم اس سوال کی جامعیت کو سامنے رکھتے ہوئے صورتِ حال کا تجزیہ کریں۔

خط میں جس پریشانی و اضطراب کا اظہار کیا گیا ہے، اس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً۔

(۱) ایک ملک ہے جس میں نہ کوئی حکومت قائم ہے، نہ کوئی آئین و ضابطۂ قوانین رائج۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں عوام کو ظلم و غارت گری کے خلاف جدوجہد اپنے طور پر آپ ہی کرنی پڑے گی۔ اس کے سوا وہاں کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔ پاکستان میں صورتِ حال یہ نہیں۔ یہاں ایک حکومت قائم ہے اور قوانین رائج۔

(۲) ایک ملک میں حکومت بھی قائم ہے اور قوانین بھی رائج۔ اس میں ایک فرد، یا گروہ یا چند عناصر قانون شکنی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے عوام کیا کریں۔ اس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً۔

(۱) کسی گاؤں پر ڈاکو حملہ کر دیتے ہیں اور اتنی مہلت نہیں دیتے کہ پولیس تک اطلاع بھیجی جاسکے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت گاؤں کی آبادی ہی ان کی مدافعت کرے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس مدافعت میں ہتھیار تک بھی استعمال کرنے پڑیں اور بعض جانیں بھی تلف ہو جائیں۔ یہ حفاظتِ خود اختیاری کی شکل ہے جو انفرادی طور پر بھی ہوسکتی ہے اور گروہوں میں بھی۔ قانون آپ کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ ایسے حالات میں کسی دوسرے مظلوم کی حفاظت کرنا آپکا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔

(ب) ڈاکو ڈاکہ ڈال کر — بعض افراد کو قتل کر کے اور بعض کا گھر بار لوٹ کر جلا کر چلے جاتے ہیں اور گاؤں والے ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ وہ پلٹ کر ان پر حملہ نہیں کرتے بلکہ بھاگ اٹھتے ہیں۔ ایسی صورت میں گاؤں والوں کو اجازت نہیں دیجاسکتی کہ وہ ان بھاگتے والے ڈاکوؤں پر گولی چلا دیں۔ اسلئے کہ یہ حفاظتِ خود اختیاری کی مجبوری نہیں ہوگی، قانون شکنی پر ان کا مواخذہ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے گاؤں والوں کو حکومت کی ایجنسی کیطرف رجوع کرنا ہوگا۔ کسی فرد یا گروہ کو اس کی اجازت نہیں دیجاسکتی کہ وہ دوسروں کو قانون شکنی کی سزا خود ہی دینے

تک جائیں۔ سزا دینا عدالت کا کام ہے، افراد کا نہیں۔ اگر افراد کو اس کی اجازت دے دی جائے ۔۔۔ یا وہ قانون کو از خود اپنے ہاتھ میں لے لیں، تو معاشرہ میں ایسی انارکی پھیل جائے جس میں کسی کا کچھ محفوظ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجرم کو سزا دینے کے لئے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا بجائے خود جرم ہے۔

اگر آپ مجرم کو سزا دلانے کے لئے حکومت کی طرف رجوع کرتے ہیں، لیکن (کسی وجہ سے) حکومت کی ایجنسی اسے سزا نہیں دیتی۔ تو بھی آپ اسے از خود سزا نہیں دے سکتے

(ج) کسی جگہ ایسے جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے جس میں آپ کی یا (یا کسی اور کی) حفاظتِ خود اختیاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا، تو آپ کو اس قانون شکنی کے انسداد کے لئے حکومت کی ایجنسی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آپ اسے از خود جبراً روکنے کے اقدامات نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنے سے بھی معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔

اگر حکومت، آپ کی اطلاع دہی کے باوجود، اس کی روک تھام کا کوئی انتظام نہیں کرتی، تو آپ اسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتے ہیں۔ قوم کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتے ہیں۔ اس آواز کو دور دور تک پھیلانے کے انتظامات کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ آپ کو نہایت پُرامن طریقہ سے کرنا ہوگا۔ قرآن کریم نے مظلوم کو "آواز بلند کرنے" کا حق دیا ہے، جہاں کہا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (۴/۱۴۸) قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہیں دیا۔ وہ ہر مشاجرت میں حکومت کو حَکَم (فیصلہ دینے والی اتھارٹی) قرار دینے کا حکم دیتا ہے (۴/۶۵)۔ اور ہر منازعت میں اسی کی طرف رجوع کرنے کی پابندی عاید کرتا ہے (۴/۵۹) حتےٰ کہ وہ اس کی بھی تاکید کرتا ہے کہ اگر عام تک کوئی ایسی خبر پہنچے جس سے معاشرہ متاثر ہوتا ہو، تو اسے بھی اربابِ نظم و نسق تک پہنچاؤ تاکہ وہ اس کی چھان بین کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ (۴/۸۳)

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام اقدامات کے باوجود اگر حکومت اس کی روک تھام کا کچھ انتظام نہ کرے ۔۔۔ خواہ اس کی وجہ اس کی غفلت یا نااہلی ہو، یا قانون شکن عناصر کے ساتھ ساز باز ۔۔۔ تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر لکھیں گے۔

(د) ملک میں قانون ہی ایسا رائج ہو جو معاشرہ کے لئے تباہی کا موجب ہو، تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔

اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح سے کیا جائے گا کہ وہ قانون معاشرہ کے لئے تباہ کن ہے یا نہیں۔ سیکولر نظامِ حکومت میں اس کے لئے کوئی مستقل معیار نہیں ہوتا۔ اس میں حکومت کا فیصلہ ہی معیار ہوتا ہے خواہ وہ حکومت شخصی ہو یا جمہوری، پارلیمانی ہو یا صدارتی۔

نہ ہی تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کی حکومت) میں اس کے لئے کوئی معیار ہوتا ہے، اس میں مذہبی پیشواؤں

کا فیصلہ ہی قولِ فیصل قرار پاتا ہے۔

لیکن قرآنی نظامِ حکومت میں اس کا معیار خدا کی کتاب ہوتی ہے جو مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ سیکولر یا پاپائی حکومت میں، جو فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق کیا جائے، وہ عدل کے تقاضا کو پورا کرے گا لیکن قرآنی نظامِ حکومت میں خود اس قانون کا کتاب اللہ کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے ۔۔۔ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۔ (۷/۱۵۹) یہ لوگ الحق (کتاب اللہ) کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے کرنے کو قرآن نے ایمان اور اس کے خلاف فیصلے کرنے کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ (۵/۴۴)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملک میں کوئی ایسا قانون رائج ہو جو کتاب اللہ کے خلاف ہو، تو پھر کیا کیا جائے؟ اور یہی ہے درحقیقت وہ سوال جسے اس خط میں سامنے لایا گیا ہے اور جو اس ذہنیت کی پیدائش اور پرورش کا موجب بن رہا ہے جس کا اظہار اس میں کیا گیا ہے، اور جسے ہم نے اپنی نئی نسل کی عمومی ذہنیت قرار دیا ہے۔ اس خط میں جن لوگوں کو ظالم اور غاصب قرار دیا گیا ہے وہ (مصطلح) ڈاکو، رہزن، قزاق نہیں۔ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو نظامِ سرمایہ داری کی وجہ سے دوسروں کی محنت غصب کر کے دولت سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری ہمارے ملک کا رائج الوقت نظام (قانون) ہے۔ لہٰذا یہ لوگ قانون شکنی کے مرتکب ہو کر دوسروں کو نہیں لوٹتے۔ ان کی لوٹ اس غلط نظام کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا سوال ان لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نہیں، اصل سوال اس غلط نظام کے بدلنے کا ہے جس کے نتیجہ میں ان کی سرمایہ داری مطابق قانون قرار پا رہی ہے۔ اگر ہم اس نظام یا قانون کو بدلوانے کے بجائے، ان افراد کے مارنے، جلانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو سوچئے کہ ملک میں کیا حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اسے آپ ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ علماء کی طرف سے حال ہی میں یہ فتوے صادر ہوا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت کرنے والے (سوشلسٹ) کافر ہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ جس مسلمان کو کافر قرار دے دیا جائے وہ مرتد ہو جاتا ہے، اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ لیکن ملک کا مروجہ قانون، ارتداد کو جرم ہی قرار نہیں دیتا، چہ جائے کہ اس کی سزا قتل قرار پائے۔ اب اگر یہ حضرات موجودہ قانون کو بدلوانے کے بجائے، خود ہی ان لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیں جو ان کے فتوے کی رُو سے کافر (یعنی مرتد) قرار پا چکے ہیں، تو فرمائیے، آپ کا اس وقت ردِ عمل کیا ہوگا؟

یا مثلاً قرآن کی رُو سے زنا کی سزا سو کوڑے (یا علماء حضرات کے نزدیک سنگسار کرنا) ہے لیکن ملک کا رائج الوقت قانون، ایک غیر شادی شدہ، بالغ جوڑے کی باہمی رضامندی سے (بلا نکاح) جنسی تعلقات کو جرم قرار نہیں دیتا۔ اب اگر لوگ، اس قانون کو بدلوانے کے بجائے، اس قسم کی حرکت کے مرتکب جوڑوں کو پتھر مار مار کر

ہلاک کرنا شروع کر دیں، تو کیا آپ اسے روا رکھیں گے؟

ذرا سوچئے کہ اگر اس شکل کو روا قرار دے دیا جائے تو ملک میں کوئی ایک شخص بھی کا بھی جس کی جس وقت کسی کا جی چاہے، پٹائی نہ کر دی جائے یا جان سے نہ مار دیا جائے۔ اسلئے کہ ہم میں سے کون ہے جس کے معمولاتِ زندگی میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نظر نہ آجائے جو کسی دوسرے کے نزدیک خلافِ شریعت ہو!

لہٰذا، اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک میں نافذ شدہ غلط نظام اور قوانین کو بدلا جائے۔ ہم اس باب میں خوش قسمت ہیں کہ ہم اس دور میں پیدا ہوئے ہیں جب زمانہ، قوانین سازی اور قوانین میں تبدیلی کے لئے قرآن کے تجویز کردہ مشاورتی طریق کی طرف آ رہا ہے۔ (اسے مغربی اصطلاح میں جمہوریت کہا جاتا ہے) اس میں شبہ نہیں کہ یہ طریق ابھی بتمامہ قرآنی خطوط پر متشکل نہیں لیکن گذشتہ ادوار کے استبدادی اور شخصی طرق کے مقابلہ میں فی الجملہ بہتر ہے۔ اگر اس کے نتائج ہنوز اتنے خوشگوار مرتب نہیں ہوئے تو اسکے ایک بڑی حد تک ذمہ دار ہم خود ہیں۔ بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قوانین کو بدلوانے کے لئے ملک میں جمہوری طریق اختیار کیا جائے، نہ کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔

اس مقام پر وہ سوال سامنے لایا جاتا ہے جس کی طرف ہم شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی حکومت جمہوری طریق سے ایسا نظام بدلنے کے لئے تیار نہ ہو، تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں خود اس حکومت کو بدل دیا جائے۔ لیکن حکومت کو بھی آئینی اور قرآن کے مشاورتی طریق سے بدلا جائے۔ قتل و غارتگری اور شورش انگیزی و ہنگامہ خیزی سے نہیں۔ جو حکومتیں فساد انگیزی سے قائم کی جاتی ہیں وہ نہ زیادہ عرصہ تک قائم رہا کرتی ہیں، نہ خوشگوار نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ آپ نے 'فساد انگیزی کے ذریعے حکومت بدلنے کا تجربہ پچھلے سال (اوائل ۱۹۶۹ء) میں کر کے دیکھ لیا ہے۔ اُس حکومت کو تو آپ نے بیشک بدل دیا لیکن اس کی جگہ مارشل لاء کی حکومت آئی، جمہوری نہیں۔ اب مارشل لاء کی حکومت خود کہہ رہی ہے کہ تم ملک میں جمہوری انداز کی حکومت قائم کر لو تو ملک نے جمہوری انداز اختیار کرنے کے بجائے اسی قسم کی فساد انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں شروع کر دی ہیں اس لئے کہ انہیں ایک حکومت کی جگہ دوسری حکومت قائم کرنے کا طریق یہی سکھایا گیا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ "راہ نمایانِ قوم" نے اُس وقت، نوجوانانِ ملت کو استبدالِ حکومت کا وہ طریق سکھایا تھا، اور اب یہ انہیں اس سے روکتے ہیں۔ نہیں! اب بھی ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے ہم آہنگ نوجوانوں کو اُکساتے ہیں کہ وہ دوسروں کے خلاف وہی (۱۹۶۹ء والے) حربے استعمال کریں۔ وہ یہ حربے استعمال کرتے ہیں تو ان کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے۔ انہیں مجاہدینِ ملت قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی ان ہنگاموں میں مر جاتا ہے تو اسے شہید کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لیکن جب مخالف پارٹی کے افراد بھی کچھ ان کے ساتھ کرتے ہیں تو دہائی

دے دی جاتی ہے کہ یہ مفسد ہیں، شر انگیز ہیں، ان کا قلع قمع کیا جانا ضروری ہے۔ اور ان کا قلع قمع کرنے کے لئے بھی حکومت سے نہیں کہا جاتا۔ اپنے ہاں لٹھ بازوں کی تنظیمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اور اس سارے پروگرام کا نام "بحالی جمہوریت" رکھا جاتا ہے۔ ان حضرات نے ہماری نئی نسل کی ذہنیت کو (جو نہایت عمدہ صلاحیتوں کی مالک تھی) اس قدر بگاڑ دیا ہے کہ وہ اب آئینی طور پر معاشرہ میں تبدیلی لانے کی بابت سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس انداز سے آپ جس قسم کی نئی حکومت قائم کریں گے (بشرطیکہ ایسا ہو سکا) کیا وہ کسی انداز سے بھی جمہوری کہلا سکے گی اور اس سے صحیح مشاورتی انداز کی حکومت کے نتائج مرتب ہو سکیں گے؟ سوچئے کہ نوجوانوں کو اس قسم کی روش پر آمادہ کرنا، قوم اور ملک سے دوستی کہلائے گا یا دشمنی؟ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے پاکستان سے کوئی دیرینہ انتقام لینا تھا جس کے لئے اس کی بربادی کی یہ تمام تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ اور لائی جا رہی ہیں قوم کے انتہائی بہی خواہ اور اسلام کے سب سے بڑے حامی و مددگار ہونے کے دعاوی کے ساتھ۔ یا للعجب!

کرنے کا کام یہ ہے کہ ان ہنگامہ آرائیوں کو ختم کر کے قرآن کے صحیح مشاورتی انداز سے حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ موجودہ جمہوری طریق سے صحیح نمائندگان کے منتخب ہونے (فلہٰذا اچھی حکومت قائم ہونے) کا امکان نہیں۔ لیکن اس کا علاج فساد برپا کرنا نہیں۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے، کہ نہایت امن و سکون سے قوم میں اس کا شعور بیدار کیا جائے کہ لوگ "اچھے سے اچھے" نمائندہ کے حق میں ووٹ دیں۔ "اچھے" کا معیار کسی خاص پارٹی سے وابستگی نہیں بلکہ امیدوار کا ذاتی طور پر پاکیزہ سیرت، بلند کردار اور موزوں صلاحیتوں کا مالک ہونا قرار دیا جائے۔ اور کسی پر کسی قسم کا لیبل نہ چسپاں کیا جائے — ہم میں، مومن متقی، صالح اور ان کے برعکس، کافر، ملحد، بے دین کی اصطلاحات تو پہلے سے عام تھیں۔ اب ان میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے "اسلام پسند" کی اصطلاح۔ یہ اصطلاح ایک غیر مسلم کے لئے وضع کی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص مسلمان تو نہیں لیکن اسلام کی بعض باتوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اب ہمارا خالی پن ملاحظہ ہو کہ ہم خود مسلمانوں کو دو فریقوں میں تقسیم کر رہے ہیں — ایک "اسلام پسند" اور دوسرا "اسلام ناپسند" اور اس کا معیار یہ ہے کہ جو شخص آپ کی پارٹی کے ساتھ ہے وہ "اسلام پسند" ہے، جو آپ کے ساتھ نہیں وہ "اسلام ناپسند" ہے۔ جونہی وہ "اسلام ناپسند" آپ کا ہمنوا ہو جاتا ہے "اسلام پسند" بن جاتا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی چاہتا ہے کہ یہاں اچھی حکومت قائم ہو تاکہ وہ غلط قوانین کی جگہ صحیح قوانین نافذ کرے، تو اس کا طریق یہ ہے کہ موجودہ فساد انگیزیوں اور ہلڑ بازیوں کو چھوڑ کر نہایت امن و سکون سے قوم میں اس کا شعور بیدار کیا جائے کہ کسی پارٹی سے وابستگی اور کسی قسم کے لیبل کو دیکھے بغیر ووٹ اسے دیا جائے جو سیرت

کے اعتبار سے بہتر اور صلاحیتوں کے اعتبار سے عمدہ ہو۔

(۰)

خط میں یہ کہا گیا ہے کہ اس وقت ملک میں اسلامی حکومت قائم نہیں۔ نہ ہی ایسی حکومت قائم ہونے کا کوئی امکان نظر آتا ہے اور غریب اور مظلوم استبداد کی چکی میں پس رہے ہیں۔

"میرا ایمان ہے کہ اسلام نے ایسے حالات کا بھی یقیناً کوئی حل ضرور پیش کیا ہوگا۔ مولانا بھاشانی نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے مگر آپ کی دور رس عقابی نگاہ اس مسئلہ میں کیوں دقیانوسی ملائیت کا شکار ہو گئی ہے"۔

اور ہمارا مؤقف یہ ہے کہ مولانا بھاشانی نے جو حل تلاش کیا ہے وہ اسلامی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے حالات کا اسلام نے کیا حل پیش کیا ہے۔

مسلمانوں کے غیر اسلامی حکومت میں رہنے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) حکومت غیر مسلموں کی ہو اور مسلمان اس میں رعایا (یا آجکل کی اصطلاح میں اقلیت) کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ یہ مسلمانوں کا مستقل نہج زندگی نہیں ہو سکتا۔ مسلمان خالص اسلامی زندگی صرف اپنی آزاد مملکت میں بسر کر سکتا ہے۔ اس اضطراری اور عارضی نہج زندگی کی مثال نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقاءؓ کی مکمل زندگی ہے۔ اس زندگی میں ہر چند مکہ میں کوئی منظم حکومت قائم نہیں تھی لیکن معاشرہ بہر نوع غیر اسلامی تھا۔ اس زندگی میں حضورؐ اپنی جماعت کی تشکیل اور قیام مملکت کے ابتدائی مراحل کی ترتیب میں مصروف رہے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں آپ نے مکی معاشرہ کے خلاف کوئی شورش برپا نہیں کی۔ کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کیا۔ مخالفین نے اس جماعت کو سخت سے سخت تکالیف پہنچائیں۔ انہوں نے ان تمام تکالیف اور صعوبات کو نہایت ثبات و استقامت سے برداشت کیا لیکن کہیں فساد برپا نہیں کیا۔ اس کے بعد جب دیکھا کہ دوسرے مقام (مدینہ) میں اپنی مملکت قائم کرنے کے لئے فضا سازگار ہے تو ہجرت کر کے وہاں چلے گئے۔ اس کے بعد مکہ میں جو مسلمان ایسے رہ گئے جنہیں مخالفین نے ہجرت کرنے سے روک دیا تو مدینہ کے مسلمانوں کو خدا کی طرف سے حکم ملا کہ وہ ان کی مدد کے لئے اٹھیں۔ اور انہیں اس ظالم بستی سے نکالنے کی صورت پیدا کریں۔ (دیکھئے ۔ ۴/۷۵) یہ حالت آج ہندی مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو گئی ہے جس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ مملکت پاکستان مملکتی سطح پر انتظامات کے تحت (مبادلہ آبادی کے اصول کے مطابق) ان مظلوموں کو وہاں سے نکال لائے۔ اگر ہندو حکومت اس کے لئے آمادہ نہ ہو اور ہم میں ہمت ہو تو اس کے لئے ہم پر جنگ کرنا بھی لازم آجاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کے جہاد نے ثابت کر دیا تھا کہ ہم ایسی جنگ کر سکتے ہیں لیکن پاکستان دشمن طاقتوں نے ایک خاص سازش کے ماتحت ہمیں ایک دوسرے سے لڑا کر کمزور کر دیا ہے ——

مسلمان ممالک میں اس قسم کی باہمی جنگ، مذہب کی آڑ میں بڑی آسانی سے کرائی جا سکتی ہے۔ یہی حربہ یہاں استعمال کرایا جا رہا ہے۔

(۲) دوسری شکل وہ ہے جسے زیرِ نظر خط میں سامنے لایا گیا ہے۔ یعنی مملکت کی آبادی بھی مسلمانوں کی ہو اور حکومت بھی ان کی اپنی، لیکن حکومت ہو غیر اسلامی۔ یہ شکل ایک غلط مفروضہ کی پیدا کردہ ہے۔ اس لئے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی مملکت کے رہنے والے فی الواقعہ مسلمان ہوں اور ان کی حکومت غیر اسلامی ہو۔ اگر مسلمانوں کی اپنی مملکت ہے اور وہ ہیں بھی فی الواقعہ مسلمان، تو ان کی حکومت لازماً اسلامی ہوگی۔ اگر پاکستان میں اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم تو پکے اور سچے مسلمان تھے لیکن ایک گروہ مریخ سے اتر کر یہاں آ جاتا تھا اور غیر اسلامی حکومت قائم کر کے ہمیں اس کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ ازمنۂ قدیمہ میں تو ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بیرونی طاقت کسی ملک پر حملہ آور ہو کر وہاں کے رہنے والوں کو اپنے اقتدار کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے۔ ملوکیت اور استعمار (COLONISATION) میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف حکومت کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے لیکن پاکستان میں تو ان میں سے کوئی صورت نہیں تھی۔ یہاں ہماری اپنی آزاد، خود مختار مملکت تھی (اور ہے) جس میں ہم اپنی منشاء کے مطابق حکومت قائم کر سکتے تھے (اور کر سکتے ہیں) لہٰذا اگر یہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکی تو اس لئے کہ ہمارا شمار ان لوگوں میں تھا جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ - (۲/۸)۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے تو ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ اس سے مراد "منافقین" کا گروہ نہیں۔ یہ ہمارے ہی متعلق کہا گیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا دعوےٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شخص اس کا اعتراف کرتا ہے — پوری کی پوری قوم اس کا رونا روتی ہے کہ ہم میں مسلمانوں کی کوئی بات نہیں — یہ الگ بات ہے کہ ہمارے زعماء کرام یہ کہہ کر اپنے آپ کو مستثنیٰ کر لیتے ہیں کہ اس انبوہِ عظیم کا حال یہ ہے کہ ان میں کے ہزار میں سے (۹۹۹) کافرانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ایک کی استثناء اپنے لئے ہوتی ہے۔ بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ کسی آزاد مملکت کے رہنے والے واقعی مسلمان ہوں اور ان کی قائم کردہ حکومت غیر اسلامی ہو۔ یہ جو یہاں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے دعوے دار لٹھ لئے پھرتے ہیں، ان کے تو معلوم نہیں عزائم کیا ہیں۔ اگر ان کا مقصود فی الحقیقت اسلامی حکومت قائم کرنا ہوتا، تو ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ پہلے اسلامی حکومت کا نہایت واضح تصور متعین کرتے اور پھر نہایت پُرامن، فکری طریق سے اس تصور کو عام کرتے چلے جاتے۔ صحیح تعلیم و تربیت سے نئی نسل کے قلب و نگاہ میں اسلامی تبدیلی پیدا کرتے۔ اس سے آئینی اور جمہوری انداز سے رفتہ رفتہ اسلامی حکومت

قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے قوم سے یہ کہا کہ تم سب کافرانہ زندگی بسر کرتے ہو۔ صالحین ہم ہیں، اس لئے اقتدار ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کریں۔ یہ حق کسی مامور من اللہ (نبی) کو تو پہنچ سکتا تھا کہ وہ جس معاشرہ میں پیدا ہو، اسے غلط کار قرار دے کر، ان سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرے۔ لیکن ختم نبوت کے بعد اس قسم کا حق کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قوم، اس قسم کی ڈکٹیٹر شپ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی (نہ ہو سکتی تھی) وہ جب ان صالحین کو دیکھتی تو انہیں اپنے جیسا، اور اکثر اوقات اپنے سے بھی بدتر پاتی اس لئے وہ ان کے حق حکومت کو کس طرح تسلیم کر لیتی؟ پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے مدعیوں اور باقی مسلمانوں میں جو کشمکش بیس بائیس سال سے مسلسل جاری ہے، اس کی اصل و بنیاد یہ ہے۔ اب جب اسلامی نظام قائم کرنے کے ان مدعیوں نے دیکھا کہ عوام ان کی مقدس "آمریت" تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے تو انہوں نے شورش خیزیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے وہی حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے جو ہر ڈکٹیٹر اختیار کیا کرتا ہے۔

ہم ایک بار اس حقیقت کو پھر دہرا دیں کہ جس قسم کے ہم (مسلمان) ہیں اسی قسم کی ہماری حکومت ہو گی۔ اس وقت دنیا کے تمام "اسلامی ممالک" میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں۔ اسلامی حکومت کہیں نہیں۔ اسلامی حکومت چند شرعی احکام کے نفاذ سے قائم نہیں ہو جاتی۔ اسلامی حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جن کے قلب و نگاہ میں اسلامی روح سرایت کر چکی ہو۔ لہٰذا، بحالات موجودہ، پاکستان یا دیگر اسلامی ممالک میں جہاں بھی حکومت قائم ہو گی وہ مسلمانوں کی حکومت ہو گی۔ مسلمانوں کی حکومت کو اسلامی حکومت میں تبدیل کرنے کا طریق بڑا ہمت طلب اور صبر آزما ہو گا۔ یہ مقصد قوانین کی تبدیلی سے حاصل نہیں ہو سکیگا۔ انسانوں کی تبدیلی سے حاصل ہو گا۔ اور انسانوں کی تبدیلی بتدریج صحیح قرآنی تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم پاکستان میں مسلمانوں کی (جیسے کچھ بھی ہم ہیں) حکومت کو اہمیت نہیں دیتے۔ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہر نوع غیروں کی غلامی سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لئے کوئی ایسی حرکت جس سے اس مملکت کو ضعف پہنچے، ہمارے نزدیک قابل ستائش نہیں قرار پا سکتی۔ بنا بریں، اس مملکت میں گھیراؤ اور جلاؤ، یا شورشوں اور ہنگاموں سے کوئی تبدیلی پیدا کرنا، اسلامی طریق نہیں کہلا سکتا۔

محترم مکتوب نگار کو شکایت ہے کہ ـــ درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ ـــ ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے جس نے آپ کو قعر دریا میں تختہ بند کر رکھا ہے؟ آپ کی تو حالت یہ ہے کہ کمرے کو خود ہی اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے اور پھر خود ہی رو رہے ہیں کہ ہم باہر کیسے نکلیں۔ اور باہر نکلنے کا طریق یہ سوچ رہے ہیں کہ مکان کو آگ لگا دی جائے۔ نہ در و دیوار باقی رہیں گے نہ ہم محبوس ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے قلب و نگاہ میں جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے

ہم اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتے ۔۔۔ اس لئے کہ وہ تو اپنے آپ سے اور خارجی قوتوں سے مسلسل جہاد کرنے کی زندگی ہے ۔۔۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ "اسلامی حکومت" کے لئے کوئی پگ ڈنڈی (SHORT - CUT) مل جائے۔ ان کے نزدیک وہ شارٹ کٹ "مارو۔ جلاؤ" ہے۔ ہم ان حضرات سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اپنے پیشِ نظر مقصد کے حصول کے لئے جو نسا طریق جی چاہے اختیار کریں لیکن خدا کے لئے اس طریق کو اسلام کیطرف منسوب تو نہ کریں۔ اسلام کو ہم "زندگی کی اہم ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنے اور اصول توڑنے" کے فتاویٰ سے پہلے ہی کافی بدنام کر چکے ہیں۔ اب فساد فی الارض اور ہلاکت حرث و نسل (۲/۲۰۵) کو اسلامی طریق کہہ کر اسے اور بدنام تو نہ کریں! واضح رہے کہ جو لوگ "مارو۔ جلاؤ" کی مذمت اور مخالفت کرتے ہیں ان کے ہاں شورش انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں معمولِ حیات بن چکی ہیں اور انہیں نہ مذموم خیال کیا جاتا ہے نہ اندازِ جمہوریت کے خلاف۔ اگر "مارو، جلاؤ" غیر اسلامی طریق ہے تو یہ شورشیں اور ہنگامے کہاں کے اسلامی ہیں!

—— (o) ——

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ایک اور غلط تصور بھی عام ہے۔ وہ یہ کہ حکومت کوئی بھی ہو، اگر آپ کو اس میں کوئی بات ایسی نظر آئے جو آپ کے نزدیک غلط ہے تو آپ کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ آپ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ آپ کا یہ اقدام جہادِ عظیم قرار پائے گا۔ اور آپ کو بطلِ حریت کہہ کر پکارا جائے گا۔ اس متشددانہ تصور کا نتیجہ ہے کہ آپ کی حکومتیں خود اپنوں ہی کے ہاتھوں تباہ ہوتی رہیں۔ باطل کی مخالفت اور حق کی حمایت میں آواز اٹھانا بے شک تقاضائے حریت ہے۔ لیکن پہلا سوال یہ ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ جسے آپ نے باطل کہہ کر اس کے خلاف قدم اٹھایا ہے وہ فی الواقعہ باطل ہے۔ اگر ہر شخص کو اس کا فیصلہ کرنے کا حق انفرادی طور پر دے دیا جائے تو اس کا جو نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

دوسرا غور طلب سوال یہ ہے کہ اپنی حکومت میں اگر کوئی بات ایسی نظر آئے جسے آپ غلط سمجھتے ہوں، تو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا طریق اور اس کی حد آخر کیا ہوگی؟ کیا آپ حکومت کے خلاف بغاوت شروع کر دیں گے؟ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ اس خاص معاملہ کے متعلق آئینی طور پر آواز بلند کیجئے۔ قومی شعور بیدار کیجئے، حتیٰ کہ آئینی اور جمہوری انداز سے خود اس حکومت کو تبدیل کر دیجئے لیکن ملک میں فساد اور بغاوت برپا نہ کیجئے۔ دیکھئے اس باب میں ہمیں حضور نبی اکرمؐ کی بارگاہ سے کیا ہدایت ملتی ہے۔ آپ مشکوٰۃ کا باب الامارۃ والقضاۃ نکالئے۔ اس میں آپ کو اس قسم کے ارشاداتِ نبویؐ ملیں گے کہ

(۱) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص اپنے حاکم کی طرف سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اس کو ناگوار ہو تو صبر کرے۔ اس لئے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر جدا ہو اور اس حالت میں مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ (بخاری مسلم)

یا یہ کہ

(۲) جو شخص تم پر حاکم بنایا جائے اور تم اس کے کسی ایسے فعل کو دیکھو جو خدا کی نافرمانی پر مبنی ہے تو تم اس کے اس فعل کو برا سمجھو اور اس کی اطاعت سے دست بردار نہ ہو۔ (مسلم)

نیز۔

(۳) اوائل بن حجرؓ کہتے ہیں کہ سلمہ بن یزید جعفیؓ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ! آپ اس معاملہ میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر ہم پر ایسے امراء مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق مانگیں اور ہمارے حقوق سے انکار کریں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان کے احکام کو سنو اور اطاعت کرو کہ ان پر وہ بات فرض ہے جو انہوں نے اپنے ذمہ لی ہے اور تم پر وہ چیز جس کی ذمہ داری تم نے لی۔ (مسلم)

اور ابوداؤد کی یہ روایت کہ

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد تم اپنے اماموں (حاکموں) کے ساتھ کس طرح بسر کرو گے جبکہ وہ کافروں سے خراج اور جزیہ لیں اور مستحق لوگوں کو نہ دیں۔ یعنی ایسی حالت میں صبر کرو گے یا ان سے لڑو گے۔ اس نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ میں اپنی تلوار کو اپنے کندھے پر رکھ کر ان سے قتال کروں گا اس وقت تک کہ میں آپؐ سے جا ملوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تم کو اس سے اچھی بات سے بتلاؤں۔ تو صبر کر جب تک تو مجھ سے آملے۔

یہی وہ تعلیم نبویؐ ہے جس کا مظاہرہ ہم ابھی تک اپنی نمازوں میں کرتے ہیں۔ اگر نماز میں امام سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو مقتدیوں کا فریضہ اتنا ہی ہے کہ وہ کسی طرح اشارہ کنایہ سے اسے متنبہ کریں کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود امام اپنے فیصلے کے مطابق عمل کرتا جائے تو مقتدیوں میں سے کسی کو

نہ تو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر امام کو الگ کر کے خود نماز پڑھانے لگ جائے اور نہ ہی اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ جماعت سے الگ ہو کر اپنی نماز جدا پڑھ لے۔ ان تمام مقتدیوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس غلط فیصلے میں بھی امام کی پیروی کریں اور بعد میں اس کے ساتھ سجدۂ سہو نکالیں۔

لیکن ہم اس ستم کی ہدایات کو مسجد کی چار دیواری تک محدود رکھتے ہیں، زندگی کے دوسرے گوشوں میں نہ صرف یہ کہ ان کی متابعت ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ان کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

یہ جو ہمارے ہاں عام ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے کہ حکومت کی جو بات بھی ناگوار گذرے اس کے خلاف سرکشی اختیار کر لی جائے، کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ اسلامی تو ایک طرف، اسے عام معانی کے لحاظ سے جمہوری طریق بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یاد رکھئے جس طریق میں ذرا سا بھی قوت کا استعمال ہو اسے جمہوری طریق نہیں کہا جائے گا۔ اور "قوت کا استعمال" مار دھاڑ، دنگا فساد تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ دوسروں کی تذلیل و تحقیر، جھوٹے الزامات اور بہتان کی تشہیر، سب و شتم، نعرہ بازیاں، ہنگامہ آرائیاں — حتیٰ کہ گاندھی کے اتباع میں اہنسا (عدم تشدد) کی سول نافرمانی اور دھرنا، بھوک ہڑتال وغیرہ سب قوت کے استعمال کے مختلف روپ ہیں۔ جمہوری (اور اسلامی) طریق آئین و قوانین کی پابندی اور دلائل و براہین کی رُو سے دوسروں کو اپنا ہمنوا بنانے اور صداقت کا قائل کرانے کا نام ہے۔

---- (۰) ----

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ غریبوں کی بھوک مٹانے اور مفلسوں کی احتیاج ختم کرنے کا طریق "مار دو اور جلا دو" نہیں۔ یہ تخریب ہے۔ اس کا صحیح علاج اس نظام کو بدلنا ہے جس کی وجہ سے غریبوں اور مفلسوں کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ اور نظام کو بہرحال آئینی طریق ہی سے بدلنا چاہیئے۔ جب یہ دروازہ ہمارے سامنے کھلا ہے تو پھر تخریبی راستے کیوں اختیار کئے جائیں! واضح رہے کہ (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) تخریبی راستہ صرف وہی نہیں جس کی طرف مولانا بھاشانی دعوت دیتے ہیں۔ اس وقت مختلف سیاسی پارٹیوں نے ہنگامہ آرائیوں کی جو روش اختیار کر رکھی ہے، وہ تخریبی ہے — اس وقت پاکستان کا سچا بہی خواہ، اور اسلامی طریق کا متبع وہی ہو گا جو۔

(۱) قوم کے نوجوانوں کو قانون کے احترام اور آئین و ضوابط کی پابندی کی تلقین کرے۔

(۲) آئندہ انتخابات کے لئے امن کی فضا پیدا کرے۔

(۳) انتخابات کے لئے قوم میں اس شعور کو بیدار کرے کہ کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیا جائے جو کسی پارٹی سے وابستہ ہو۔ ووٹ اس امیدوار کو دیا جائے جس کی دیانت و امانت پر آپ کو اعتماد

اور جس کی صلاحیتوں کا آپ کو علم ہو۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انتخاب لاکھ دیکھ بھال کر کیجئے، جب منتخب شدہ لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے تو وہ بگڑ جاتے ہیں۔

یہ درست ہے لیکن اس کا علاج ان کے خلاف ہنگامہ آرائی نہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آئین میں ایسی شق رکھی جائے کہ جس شخص کو جن لوگوں نے منتخب کیا ہے ــــ وہ کسی پارلیمان کا رکن ہو یا وزیر (اور وزیر اعظم) حتیٰ کہ وہ صدر مملکت بھی کیوں نہ ہو ــــ وہ اگر کوئی غلط قدم اٹھائے اور اس طرح ان لوگوں کا اس پر اعتماد اٹھ جائے تو وہ اسے اسی آئینی طریق سے اس کی نشست یا منصب سے الگ بھی کر سکیں۔ یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو آئین میں اس کے لئے موثر طریق کار کی صراحت کی جا سکتی ہے۔ یہ کچھ مشکل کام نہیں۔

اس سے اگلا (اور سب سے اہم) سوال یہ سامنے آتا ہے کہ غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے اس میں غلط اور صحیح۔ یعنی حق اور باطل کے پرکھنے کا معیار بھی اسلام ہی ہونا چاہیئے۔ اور یہی ہے وہ چیز جو اس وقت سب سے زیادہ مشکل پیدا کر رہی اور ملک میں فتنہ و فساد کا موجب بن رہی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو اس باب میں اتھارٹی سمجھتا ہے ــــ اور مذہبی پیشوائیت اپنے آپ کو اتھارٹی ہی نہیں بلکہ اجارہ دار تصور کرتی ہے۔ یہ طریق قطعاً اسلامی نہیں۔ وہ اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ جس کا جی چاہے اس باب میں اتھارٹی بن بیٹھے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا "عالم" کیوں نہ ہو۔ اسلامی نظام میں اس قسم کی اتھارٹی صرف اس ادارہ کو حاصل ہو سکتی ہے جسے حکومت کی طرف سے اس مقصد کے لئے مقرر کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بحالات موجودہ یہ اتھارٹی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے سپرد کر دینی چاہیئے۔ جب بھی کسی معاملہ میں یہ سوال پیدا ہو کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، تو اسے عدالت عالیہ کیطرف (REFER) کیا جائے۔ علماء حضرات چاہیں تو اس میں بحیثیت وکیل جائیں اور اپنا موقف پیش کریں۔ لیکن فیصلہ کا حق اسی عدالت کو حاصل ہو۔ اور جو فیصلہ وہاں سے نافذ ہو وہ سب کے نزدیک واجب التسلیم ہو۔ کسی فرد یا جماعت کو اس کا حق حاصل نہ ہو کہ وہ معاملات کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے یا افراد کے کفر و ایمان کے فتوے صادر کریں اور اس طرح ملک میں سلسل فساد برپا کرنے کا سامان فراہم کئے چلے جائیں۔ آئین میں اس کی وضاحت اور اس کے لئے طریق کار کا تعین ضروری ہے۔

(۰)

یہ ہے ہماری بصیرت کے مطابق، اس ملک کے لئے سلامتی کی راہ۔ اگر اس راستے کو اختیار نہ کیا

گیا تو پھر ہماری ہزار مقدس آرزوؤں کے باوجود یہ ملک سلامت نہیں رہ سکیگا۔ اور یہ کام بہت جلد کرنے کا ہے۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھ رہے کہ اس وقت ملک میں مختلف ناموں سے تخریبی کارروائیوں پر جتنا کچھ خرچ ہو رہا ہے۔ اور اس سے جتنی تیزی سے یہ آگ پھیلائی جا رہی ہے، اس کی روک تھام میں ذرا سی تاخیر ہمیں کہاں پہنچا دے گی؟ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ شورشوں، ہنگاموں، جلوسوں، ہڑتالوں، الزام تراشیوں اور دشنام طرازیوں میں کسی فرد یا پارٹی کا ساتھ نہ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح، ان قوتوں کی ملعون سازشیں جن کی آنکھوں میں پاکستان خار کی طرح کھٹکتا ہے اور وہ اس کی (خدانکردہ) تباہی اور بربادی کے درپے ہیں، کس طرح خاسر و ناکام رہ جاتی ہیں اور وہ خود کس قدر ذلیل و خوار ہو جاتی ہیں۔

(×××)

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ سلسلہ فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت ماہ مئی ۱۹۷۰ء)

حسبِ ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے۔

فہرست (ب) ۔ (عطیات کالج فنڈ)

(۱) ضلع نوابشاہ کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۔	۹۰۰/- روپے
(۲) محترم عارف اقبال صاحب کراچی	۵۰/- "
(۳) مسٹر جسٹس قاضی محمد گل صاحب ۔ اسلام آباد ۔	۵۰۰/- "
(۴) ماسٹر محمد انور صاحب ستّوکے (ضلع سیالکوٹ)	۱۰/- "
(۵) مسز رابعہ ڈار صاحبہ ۔ لندن	۱۹۰/۸۰ "
(۶) محترم ظہور الدین بھٹی صاحب ۔ لاہور	۱۰/- "
(۷) محترم محمد شریف میر صاحب ۔ لاہور	۱۰/- "
(۸) محترم افضل عابد صاحب ۔ لاہور	۳/- "

نوٹ: قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات انہیں آر او نمبر ۶۵/(K)/۶۵۲ مورخہ ۵/۴/۶۵ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مورخہ ۱۳/۵/۶۵ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵/۵ کے ماتحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

(×××)

باسمہٖ تعالیٰ

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است ÷ اما کشاد آں ز کمان محمدؐ است

رزق کی محمدی تقسیم

عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید (منعقدہ ۱۷ مئی ۱۹۷۰ء) پر

پرویز صاحب کا برجستہ خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رزق کی محمدیؐ تقسیم

صدر محترم و عزیزانِ گرامی قدر! السلام ورحمت

ہمارا سرِ نیاز بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے کہ اس نے ہمیں یہ توفیق عطا فرمائی کہ ہم ایک بار پھر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے تذکارِ جلیلہ کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کے نقوشِ قدم ہر رہروِ حیات کے لئے جگمگاتے ستاروں کی طرح نشانِ منزل کا کام دیتے اور تا ابد کاروانِ انسانیت کے لئے خضرِ طریق بنتے ہیں۔ کسقدر خوش بخت ہیں وہ جادہ پیما جو ان درخشندہ قندیلوں کی روشنی میں سفرِ زندگی طے کرتے اور شاداں و فرحاں اپنے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچتے ہیں جہاں خدا کی کامرانی قوتیں یہ کہہ کر ان کا استقبال کرتی ہیں کہ لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ. وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۔ (۴۱/۳۰-۳۱)۔ تم قطعاً خوف نہ کھاؤ۔ کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرو۔ تم نہ افسردہ خاطر ہو نہ اداس اور غمگین۔ تمہارے لئے اس جنتی زندگی کی بشارتیں ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ تمہاری اس دنیا کی زندگی میں بھی ہم تمہارے رفیق ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی معین و مددگار۔ اس میں تم جو چاہو گے وہ ہوگا اور جو مانگو گے ملے گا۔ (یہ اس لئے کہ تم نے صحیح راستہ اختیار کیا اور ان نقوشِ قدم کا اتباع کیا جو دنیا اور آخرت دونوں میں حیاتِ افروز خوشگواریوں کے ضامن اور بہار آفریں شادابیوں کے کفیل ہیں)۔

عزیزانِ من! خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی نشوونما اور پرورش کے لئے جس قدر اسباب و ذرائع کی ضرورت تھی انہیں بھی از خود مہیا کر دیا۔ انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح حیوانی زندگی کی ہے جسے عام

انسانی زندگی کی دو سطحیں

اصطلاح میں طبیعی زندگی یا (PHYSICAL LIFE) کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی طبیعی قوانین کے تابع چلتی ہے اور طبیعی سامانِ زیست سے اس

کی پرورش ہوتی ہے۔ اس سے اوپر انسان کی انسانی زندگی ہے جس کا محور انسانی ذات (SELF OR PERSONALITY) ہے۔ اس زندگی کی نشو و نما ان مستقل اقدار کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے عطا ہوتی ہیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی حیوانی اور انسانی سطح میں مابہ الامتیاز مستقل اقدار ہیں۔ حیوان، صرف طبیعی سامانِ زیست کی بنا پر زندہ رہتا ہے۔ وہ اقدار کے تصور سے ناآشنا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے لئے طبیعی سامانِ زیست اور مستقل اقدار سماوی، دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے یہ دونوں خدا کی طرف سے نوعِ انسانی کو بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں۔ ایسا کیا جانا اس کی ربوبیت کا تقاضا تھا۔ رب العالمین ہونے کی جہت سے یہ اس کی ذمہ داری تھی۔

لیکن نظامِ کائنات میں ہم ایک عجیب تقسیم دیکھتے ہیں۔ خارجی کائنات میں خدا کی ذمہ داریاں از خود پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کی ذمہ داریاں ان انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو ان کے پورا کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ مثلاً مظلوموں (اور ناتوانوں کو مستبد اور غاصب قوتوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنا خدا کی ذمہ داری ہے۔ لیکن یہ ذمہ داری اس جماعت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جو ظلم و استبداد گری کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے شمشیر بدست اور سر بکف تیار رہتی ہے

خدا کے پروگرام کی تکمیل انسانی ہاتھوں سے

آپ عہدِ اول کی تاریخ کے اس دور کو سامنے لائیے جب مکہ کے مہاجرین نے مدینے آ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور اس طرح مستبد قوتوں کی دراز دستیوں سے مامون ہو گئے۔ لیکن جو لوگ ہنوز مکہ میں گھرے ہوئے تھے، ان کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ وہ وہاں کی سرکش قوتوں کی فتنہ سامانیوں کا تختۂ مشق بن رہے تھے۔ وہ اپنی اس انتہائی بیچارگی کے عالم میں رہ رہ کر آسمان کی طرف تکتے اور خدا سے فریاد کرتے تھے کہ وہ انہیں ان وحشی درندوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائے۔ وہ خدا سے فریاد کرتے تھے۔۔۔ اُس خدا سے جو لا انتہا قوتوں کا مالک ہے جو قادرِ مطلق ہے جس کے کلمۂ کُن سے لامحدود کائناتیں ظہور میں آسکتی ہیں۔ وہ خدا چاہتا تو آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں مکے کے ان مظلوموں کے لئے سامانِ حفاظت مہیا کر دیتا۔ لیکن اس نے از خود ایسا نہیں کیا۔ وہ انسانی دنیا میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نے کیا کیا؟ یہ خود اسی کے الفاظ میں سنیئے۔ اس نے مدینے کے مسلمانوں سے کہا کہ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ (۴/۷۵) مدینے کے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظلم کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں

نہیں آتے! کیا تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے مظلوم و ناتوان، بیکس و بے بس مرد، عورت، بچے کس طرح بلک بلک کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں اور پکار پکار کر ہم سے کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکالنے کی کوئی صورت پیدا کر دے جس کے رہنے والوں نے ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی حامی و مددگار بھیج۔ کسی کو ہمارا نجات دہندہ بنا۔

آپ نے غور فرمایا، برادرانِ عزیز! کہ مکہ کے مظلوم خدا کو مدد کے لئے پکارتے ہیں اور لامحدود قوتوں کا مالک خدا، مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ کیا تم ان مظلوموں کی پکار کو نہیں سنتے۔ کیا ان کی آہ و فغاں تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی۔ کیا تمہیں اس کا احساس نہیں ہو رہا کہ وہ کس دلدوزی اور جگرسوزی سے تمہیں مدد کے لئے پکار رہے ہیں۔ اگر تم یہ سب کچھ سنتے ہو تو پھر تمہیں انتظار کس بات کا ہے۔ تم ان کی مدد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں؟ یعنی وہ مدد کے لئے خدا کو پکارتے ہیں اور خدا مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے! اسی حقیقت کو قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ اگر خدا ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں مستبد اور سرکش جماعتوں کی روک تھام ہوتی رہے تو دنیا میں کسی اہل مذہب کی پرستش گاہ محفوظ نہ رہ سکتی۔ راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے صومعے، مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے سب مسمار ہو چکی ہوتیں۔ یہ کام تو ہمارے کرنے کا تھا، لیکن انسانی دنیا میں ہمارے کام انسانی ہاتھوں ہی سے سرانجام پاتے ہیں۔ ہم البتہ اتنا کرتے ہیں کہ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (۲۲/۴۰) جو اس پروگرام کی تکمیل میں ہماری مدد کرتا ہے ہم اس کی مدد کر دیتے ہیں۔ تکمیل اس پروگرام کی انسانوں ہی کے دست و بازو سے ہوتی ہے اور اس پر بدر و حنین کے میدانوں کے ذرات آج تک شاہد اور آسمان کی آنکھ اب تک گواہ ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے غالبؔ نے ایسے منفرد انداز میں بیان کیا ہے جس سے بہتر انداز شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔ اس نے کہا ہے کہ

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

اور اقبالؔ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں عیاں کیا ہے کہ

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

خدا کو اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے پامردیٔ مومن پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اور یہی وہ پامردی تھی جس کا اولین مظاہرہ محمد رسول اللہ والذین معہ کے کوہ شکن عزم اور خارہ شگاف ضرب کاری سے ہوا تھا۔

خدا کا یہ پروگرام میدانِ کارزار تک محدود نہیں تھا بلکہ بساطِ زندگی کے ہر گوشے کو محیط تھا۔ اس میں سب سے اہم گوشہ انسانوں میں سامانِ نشوونما کی تقسیم کا تھا۔ اور یہی وہ موضوع ہے جسے میں نے اپنے آج کے خطاب کے لئے بطور عنوان تجویز کیا ہے، اس لئے کہ اس مسئلہ نے — جسے اسلام کا معاشی نظام کہا جاتا ہے — آجکل اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ اس سے زیادہ مرکزِ توجہ کوئی اور مسئلہ رہا ہی نہیں۔

رزق کی تقسیم کا پروگرام

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی زیست کے لئے جس قدر سامان و ذرائع کی ضرورت تھی، اسے بھی ساتھ ہی مہیا کر دیا۔ انسانی زندگی کا دارومدار ہوا، پانی، روشنی اور خوراک پر ہے۔ ان کے علاوہ تمدنی زندگی میں لباس، مکان، ادویات وغیرہ بھی زندگی کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں۔ قرآن کریم میں اس تمام سامانِ زیست کے لئے رزق کی جامع اصطلاح آئی ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ رزق کے سلسلہ میں خدا کا پروگرام کیا ہے اور اس کی تقسیم کس طرح عمل میں آتی ہے۔

سامانِ زیست (یعنی رزق) کی بہم رسانی کے سلسلہ میں خدا نے اپنی عظیم ذمہ داری کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، اس نے خصوصیت سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار۔

غلط نگہی

جن لوگوں کے سامنے وہ طریقِ کار نہیں تھا جس کے مطابق انسانوں کی دنیا میں خدا اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے، انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہے فراوانیوں سے رزق عطا کر دے، جسے چاہے نانِ شبینہ تک سے محروم کر دے۔ جسے چاہے دولت کے انبار در انبار دیدے، جسے چاہے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دے۔ جسے چاہے امیر کبیر بنا دے

جسے چاہے فقیر بنوا کر رہے۔ اسی سے تقدیر یا قسمت کا عقیدہ وضع کر لیا گیا۔ (تقدیر اور قسمت ایک ہی بات ہے) کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے رزق کے سرچشموں پر اپنا تسلط جما لیا اور جن کے پاس قوت یا جتھہ نہیں تھا انہیں روٹی کے ٹکڑے تک سے محروم کر دیا جب

تقدیر کا مسئلہ

انہیں یہ شکایت پیدا ہوئی کہ انہیں رزق سے کیوں محروم کر دیا گیا ہے تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا کہ یہ سب تقسیم خدا کی طرف سے ہے۔ اسی نے ان لوگوں کو امیر بنا دیا ہے اور تمہیں غریب۔ اس تقسیم رزق کیخلاف شکایت کرنا خدا کے فیصلوں کے خلاف شکوہ کرنا ہے اور خدا کے خلاف شکوہ کرنا کسی انسان کے لئے جائز نہیں۔ تم اپنی قسمت پر شاکر رہو اور ان لوگوں کے مال و دولت کی طرف حسد کی نگاہ سے مت دیکھو۔ اللہ کے بندے ہمیشہ راضی برضا اور تقدیر پر شاکر رہتے ہیں۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ تم غریب نہ رہو تو کس کی مجال تھی کہ جو رزق تمہیں خدا کی طرف سے ملتا اسے روک لیتا۔ لیکن اگر اسی کو یہ منظور نہیں تو پھر تم لاکھ جتن کرو نہ تم اپنی غریبی کو دور کر سکتے ہو نہ کوئی دوسرا تمہاری مدد کر سکتا ہے تقسیم رزق کا یہ باطل عقیدہ قرنہا قرن سے سلسل چلا آ رہا تھا اور اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جب قرآن نے آکر اس کی تردید کی تو جن لوگوں نے ذرائع رزق کو اپنی ملکیت بنا رکھا تھا، ان کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ قرآن کریم ان لوگوں کے اس ردعمل کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ — وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ۔ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ رزق کے وہ سرچشمے جنہیں خدا نے سامانِ زیست کے طور پر تمہیں عطا کیا ہے ان پر بند لگا کر مت بیٹھ جاؤ، انہیں کھلا رکھو تاکہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ تو — قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ تو جو لوگ اس بنیادی صداقت سے انکار کرتے ہیں، ان لوگوں سے کہتے ہیں جو اس حقیقت کو سچا تسلیم کرتے ہیں کہ — اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ۔ یہ تم کیا کہتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو جو بھوکوں مرتے ہیں، روٹی کھلائیں! اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں خود فراوانی سے رزق عطا کر دیتا۔ یہ حقیقت کہ ان لوگوں پر رزق کی تنگی ہے، اس امر کی دلیل ہے کہ خدا چاہتا ہی نہیں کہ انہیں فراخیٔ رزق نصیب ہو۔ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ ہم کون ہیں جو اس کی تقسیم کو بدل دیں۔ ان کے اس جواب کی تردید میں قرآن نے کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۳۶/۴۷) تمہارا یہ مقیدہ، یہ طرزِ عمل، ایسی گمراہی پر مبنی ہے جس کے ابطال کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ تم اُن رزق کے سرچشموں پر جنہیں خدا نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عطا کیا تھا، سانپ بن کر بیٹھ گئے ہو اور جب تم سے کہا جاتا ہے کہ انہیں کھلا رہنے دو تو تم تقدیر کے خود وضع کردہ عقیدہ کی آڑ لے کر اپنی اُس روش کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا چاہتے ہو جو یکسر ضلالت پر مبنی ہے اور

کفر کا شیوہ۔

زمین کی حیثیت

رزق کا بنیادی ذریعہ زمین (ارض) ہے۔ اور زمین کی پوزیشن یہ ہے کہ۔

(۱) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ (۷/۱۰) ہم نے اس میں تم سب کے لئے روزی کا سامان رکھا ہے۔

(۲) كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ۔ (۲۰/۵۴) اس میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔

(۳) اس میں رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ہے۔ (۵۰/۱۱) یعنی تمام بندوں کے لئے سامانِ رزق۔

(۴) یاد رکھو لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ (۲/۲۸۴) ارض وسما میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ اس لئے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے اس نے تمام انسانوں کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے۔ وَسَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (۴۱/۱۰) اس میں ہر ضرورت مند کے لئے برابر کا حصہ ہے۔

یہ ہے زمین کی پوزیشن۔ اسے ہم نے تمام نوعِ انسانی کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے لیکن اس رزق کی تقسیم ہم نے خود نہیں کی۔ انسانوں کی دنیا میں ہم خود ایسا نہیں کیا کرتے۔ اس کی تقسیم خود انسانوں کے ہاتھوں سے ہوگی۔ جو انسان ہمارے قوانین سے سرکشی برتیں گے وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر دوسروں سے اپنی خدائی کا دعویٰ منوائیں گے جیسا کہ فرعون نے کہا تھا کہ اے لوگو بتاؤ! أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي۔ (۴۳/۵۱)۔ کیا یہ ملک مصر (کی زمین) اور اس میں جو نہریں بہتی ہیں، میری ملکیت نہیں؟ یہ سب میری ملکیت ہیں اس لئے تمہیں اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۷۹/۲۴) میں ہی تمہارا اَن داتا — رزق دینے والا ہوں۔ اسلئے غلبہ و اقتدار بھی میرا ہی ہے۔ لیکن جب اسکی تقسیم اُن بندوں کے ہاتھ میں ہوگی جو خدا کی ربوبیت اور ربوبیت کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے زمین کا نظم و نسق سنبھالیں گے تو وہ اعلان کریں گے کہ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ۔ (۵۵/۱۰) زمین کو خدا نے تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی — یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ہے (۵۶/۷۳) یعنی لوگوں کی بھوک مٹانے کا ذریعہ۔ اس لئے اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ جب اقتدار فراعنہ کے ہاتھ میں ہوگا تو وہ کہیں گے کہ أَلَيْسَ لِي — کیا یہ میری ملکیت نہیں؟ اور جب اس کا نظم و نسق ..... محمدؐ کے ہاتھ میں ہوگا تو اس کا اعلان ہوگا کہ۔

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے

بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابو داؤد)

حضور نبی اکرم کے اس اعلانِ عظیم نے رزق کے ذرائع اور وسائل پر ذاتی ملکیت کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا — اور یہی آسمانی انقلاب کے داعیان، حضرات انبیاء کرامؑ کا مشن تھا۔ حضرت صالحؑ نے بھی اپنی قوم کے سرداروں سے یہی کہا تھا۔ وہ چراگاہوں کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر، غریبوں اور کمزوروں کے مویشیوں کو ان میں چرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ ھٰذِہٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ۔۔۔۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ ۔ (۷/۷۳) زمین اللہ کی ہے اور یہ مویشی بھی اسی کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین کو اللہ کی مخلوق کے لئے کھلا رکھو۔

حضرت صالحؑ کے سامنے سوال یہی تھا کہ مستبد امرائے قوم غریبوں کے مویشیوں کو چراگاہوں میں چرنے نہیں دیتے تھے۔ اس لئے آپ نے ان سے اتنا ہی کہا کہ ارض اللہ کو ناقۃ اللہ کے لئے کھلا رہنے دو۔ حضور خاتم النبیینؐ کے سامنے پوری نوعِ انسانی کا سوال تھا۔ اس لئے آپؐ نے دنیا بھر کی مستبد اور غاصب اقوام سے کہا کہ ارض اللہ کو عباد اللہ کے لئے کھلا رہنے دو۔ اللہ کی زمین۔ اللہ کے بندے — تم کون ہوتے ہو جو خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر خدا کے بندوں کو اس سے رزق حاصل کرنے سے روکتے ہو۔ (اقبالؒ کے الفاظ میں) ذرا سوچو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ — زمین خدا کی ہے اور خدا کے بندوں کے لئے عام ہونی چاہیئے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے، عزیزانِ من! کہ زمین پر ذاتی ملکیت کا عملی مفہوم کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا؟ ایک شخص ایک ہزار ایکڑ زمین کے رقبہ کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر اسے کاشتکاروں کو دے دیتا ہے۔ یہ کاشتکار سال بھر جان مار کر فصل پیدا کرتے ہیں۔ اور جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو "زمین کا مالک" آتا ہے اور نہایت اطمینان سے آدھی فصل اٹھا کر اپنے گھر لے جاتا ہے۔ سوچئے کہ اس فصل پر اس شخص کا حق کیا تھا؟ صرف یہ مفروضہ کہ وہ اس زمین کا مالک ہے۔ جب حضور رسالتمآبؐ نے زمین کو خدا کی ملکیت قرار دیا تو اس نظام کو بھی ختم کر دیا جس کی رو سے محنت کوئی کرتا تھا اور فصل کوئی اور لے جاتا تھا۔ حضرت ابن ابی نعیمؒ

کی روایت ہے کہ

رافعؓ بن خدیج نے ایک زمین پر کاشت کی ۔ وہ اس کی آبیاری کر رہے تھے کہ حضورؐ اُدھر سے گزرے اور پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے اور یہ زمین کس کی ۔ رافع نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے ۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو ۔ لہٰذا "زمین" صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچ اس سے وصول کر لو ۔

حضورؐ کے اس فیصلہ کی تشریح میں نسائی میں یہ تصریح آتی ہے کہ

رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں لے سکتا ۔ فرمایا نہیں ۔ پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی بھوسہ تو لے سکتا ہے ۔ فرمایا بالکل نہیں ۔

حضورؐ نے جس زرعی انقلاب کی اس طرح ابتدا کی اس کی تکمیل حضرت عمرؓ کے زمانے میں اُس وقت ہوئی جب آپ نے عراق کی مفتوحہ زمینوں کو افراد میں تقسیم کرنے کے بجائے امت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا تاکہ ان سے افرادِ مملکت کے لئے سامانِ رزق حاصل کیا جاسکے ؛ اور یوں خدا کی زمین کو خدا کے بندوں کے لئے عام کر دیا گیا ۔ یہ تھی خدا کی زمین کی محمدی تقسیم ۔

(۸)

پہلے کہا جا چکا ہے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ

(۱) تمام ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے ۔ اور

مملکت کی ذمہ داری

(۲) خدا کی یہ ذمہ داری اس جماعت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جو خدا کے نام پر دنیا میں مملکت قائم کرتی ہے ۔

(۳) اسلام میں اس مملکت کی تشکیل سب سے پہلے خود حضور نبی اکرمؐ نے فرمائی ۔ لہٰذا اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے ۔

حضور نبی اکرمؐ نے مملکت کی اس ذمہ داری کو ان مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں بیان فرما دیا کہ :

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا

اس بستی سے اللہ تعالےٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔

(مسند امام مالکؒ)

سوال یہ ہے کہ یہ مملکت اس عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح سے کرتی تھی۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو جماعت اس مملکت کی تشکیل کے لئے ظہور میں آئی تھی، اس کی خصوصیات کیا تھیں۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس جماعت کا ہر فرد ایک معاہدہ کرتا تھا جس کی شرائط (قرآن کے الفاظ میں) حسب ذیل تھیں۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)

اس معاہدہ کی رُو سے ہر مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتا تھا، اور اس کے عوض خدا اسے جنت دے دیتا تھا۔ یہ معاہدہ محض نظری یا اعتقادی نہیں تھا کہ جی ہی جی میں (یا زبان سے) کہہ دیا کہ میں نے اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے اور اس کے بعد سب کچھ اپنے پاس رکھ لیا اور مرنے کے بعد اسے اپنے وارثوں کی طرف منتقل کر دیا۔ یہ معاہدہ سچ مچ عمل میں آتا تھا اور ہر مومن کو اپنی جان اور مال، فی الواقع "خدا کے ہاتھ" بیچ دینا ہوتا تھا۔ چونکہ خدا کی یہ ذمہ داری، اس مملکت نے پوری کرنی تھی اس لئے یہ معاہدہ بھی خدا کی طرف سے اس مملکت کے سربراہ کے ساتھ کرنا ہوتا تھا۔ اس کی تصریح خود خدا نے یہ کہہ کر کر دی کہ

مومنین کا معاہدہ

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ ۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۔ (۴۸/۱۰)

اے رسولؐ! جو لوگ اس بیع و شریٰ (خرید و فروخت) کا معاملہ تیرے ساتھ کر رہے ہیں، یہ معاملہ درحقیقت خدا کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس معاملہ کی توثیق کے لئے تو جو اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھتا ہے، تو یوں سمجھو کہ یہ ہاتھ تیرا ہاتھ نہیں، خود خدا کا ہاتھ ہے کیونکہ تو یہ معاملہ اُس کے (BEHALF) پر کر رہا ہے۔

اس معاہدہ کی رُو سے، یہ افراد مملکت اپنی جانیں اور مال، اس مملکت خداوندی کی تحویل میں دے دیتے تھے اور یہ مملکت خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد دے دیتی تھی کہ ـــــ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۔ تمہیں اور تمہاری اولاد کو سامانِ زندگی ہم مہیا کریں گے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اس جماعت کی تشکیل کا آغاز، مکی زندگی میں کیا۔ اس وقت ہنوز مملکت وجود میں نہیں آئی تھی اسلئے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا کام انفرادی طور پر عمل میں آتا تھا ـــ قرآن میں جو آپ صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ سے متعلق احکام دیکھتے ہیں تو وہ اسی زمانہ سے متعلق ہیں جب یہ نظام اجتماعی حیثیت سے تکمیل تک نہیں

پہنچا تھا۔ اس زمانے میں حضورؐ نے افرادِ جماعت کے لئے کیا طریق اختیار فرمایا تھا، اس کا اندازہ حضرت ابوموسےٰ اشعریؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

> اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں (کسی حادثہ وغیرہ کی وجہ سے) ان کے بال بچوں پر فاقے وغیرہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> رسول اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

جماعتِ مومنین کا یہی وہ مشترکہ معاشی نظام تھا جس سے حضورؐ نے "خدا کی اس ذمہ داری" کو پورا کرنے کا آغاز فرمایا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے اس جماعت کو (اس ابتدائی مرحلہ کی یاد دلاتے ہوئے) کہا ہے کہ تم اس وقت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تم میں باہمی مغائرت اور عداوت تھی۔ اس کے بعد اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کر دی ــــ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ (۳:۱۰۳) اور یوں تمہیں خدا نے اپنی نعمت سے باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔

اخوتِ اسلامی

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک بیان میں (جو ۱۹۲۳ء میں اخبار زمیندار میں شائع ہوا تھا) کہا تھا کہ خدا نے انہیں جس نعمت کی یاد دہانی کرائی ہے اور جس کی بنا پر وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے تھے، وہ قرآن کا یہی اقتصادی نظام ہے جس کا آغاز رسول اللہ نے اس طرح فرمایا تھا۔ اور جس میں "میری اور تیری" کی مغائرت اٹھ گئی تھی۔ یاد رکھیئے! یہ "میری اور تیری" کی تمیز اور تفریق ہے جو باہمی عداوت پیدا کر دیتی ہے۔ اَلْعِدْلُ اس لکڑی (WEDGE) کو کہتے ہیں جو دو لکڑیوں کے درمیان پھنسا دی جاتی ہے تاکہ وہ آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اللہ تعالےٰ نے کہا یہ ہے کہ تم میں "میری اور تیری" کی (WEDGES) حائل تھیں جن کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے عدو ہو رہے تھے۔ تمہارے رسولؐ نے ان (WEDGES) کو نکال باہر کیا اور اس طرح تم سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ یہ نظام آگے بڑھتا گیا اور افرادِ مملکت نے مختلف قسم کے کام کاج شروع کر دیئے۔ اس میں ظاہر ہے کہ لوگوں کی کمائی میں فرق تھا۔ کوئی زیادہ کماتا تھا کوئی کم۔ بعض ایسے معذور بھی تھے جو بہت کم کما سکتے تھے۔ یا کما سکنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ مملکت کا فریضہ ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا تھا۔ اس کے لئے انتظام یہ تھا کہ زائد کمائی والوں سے انکی زائد از ضرورت دولت لے کر معذوروں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کر دی جاتی تھیں

فاضلہ کمائی

اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آیا کہ زائد کمائی والوں کی کس قدر کمائی دوسروں کی

ضروریات پوری کرنے کے لئے لی جا سکتی ہے۔ قرآن میں یہ سوال اور اس کا جواب سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

> يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ — اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدیں۔
>
> قُلِ الْعَفْوَ۔ — ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زیادہ ہے وہ سب کا سب۔

قرآن کریم کے اس اصول کا عملی مظاہرہ تھا جو حضرت ابو سعیدؓ کی روایت میں اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ۔

> ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زاید ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتےٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زاید کوئی چیز رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

اسوۂ رسولؐ اللہ

چونکہ نبی اکرمؐ کی اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے نمونہ بننا تھا — اور مملکت میں صحیح نظام رائج کرنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سب سے پہلے سربراہِ مملکت خود اس نظام کا نمونہ بن کر دکھائے۔ دنیا کا بہتر سے بہتر نظام اور اچھے سے اچھا قانون کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا اگر اس نظام کے ارباب بست و کشاد اور اس قانون کے نافذ کرنے والے اصحاب حل و عقد اپنی زندگی کو اس نظام کے قالب میں نہ ڈھالیں اور اس قانون پر عمل پیرا ہو کر نہ دکھائیں۔ "زاید از ضرورت کچھ نہ رکھنے" کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا نمونہ حضورؐ نے خود اس انداز سے پیش فرمایا کہ — حضرت عائشہؓ کے الفاظ میں۔

> حضورؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا۔ دوسرا نہیں ہوتا تھا جسے تہہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔

واضح رہے کہ وفات کے وقت حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے جس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل پر پھیلا ہوا تھا۔ لیکن مملکت کے پھیلنے سے مملکت کی ذمہ داریوں میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو گیا تھا اور ان ذمہ داریوں سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہوا جا سکتا تھا کہ سربراہِ مملکت — اور اس کے اتباع میں دیگر

ارباب نظم و نسق --- اپنی ضروریات کو کم از کم حد تک سمیٹ لیں اور زاید از ضرورت ہر شے دیگر ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ ارباب نظم و نسق کی یہی وہ ذمہ داریاں ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

> جس شخص کو اللہ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنائے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے، تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتیگا۔ (ابوداؤد - کتاب الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ

> حضورؐ نے فرمایا کہ جو امام ضرورت مندوں محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ (ترمذی - کتاب الاحکام)

یہی نہیں کہ افراد مملکت کی زندگی میں ان کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری مملکت اپنے سر پر لیتی تھی، اس باب میں یہ مملکت ایک قدم اور بھی آگے بڑھتی تھی۔ چنانچہ حضورؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ

> میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض ہو فوت ہو جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی میرے ذمے ہے۔
> (ابوعبید - کتاب الاموال)

آپ نے غور فرمایا کہ تمام افراد مملکت کے لئے سامانِ زیست بہم پہنچانے کی جو ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لی تھی خدا کے نام پر قائم ہونے والی حکومت اس ذمہ داری کو کس طرح سے پورا کرتی ہے۔ اگر وہ حکومت اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتی تو اسے خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لینے کا حق حاصل نہیں۔ مملکت کے حقوق ذمہ داریاں پوری کرنے سے قائم ہوتے ہیں جس طرح افراد مملکت کے حقوق اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے مسلم ہوتے ہیں۔ اس مملکت کو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا احساس

حضرت عمرؓ کا اعلان

اس قدر شدید تھا اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے لگایا جا سکتا ہے جس سے جامع اعلان اس باب میں اور کہیں نہیں مل سکتا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ

> لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام)۔

یہ نکتہ بڑا لطیف ہے لہٰذا قدرے تشریح کا محتاج۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کسی

فرد کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ اگر کسی کی کوئی ضرورت رُک جائے گی تو وہ خدا سے اس کے لئے دعا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی کوئی ضرورت رُکے گی نہیں تو اُسے خدا سے اس کی بابت دعا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ کہنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا اس مملکت کے خلاف خدا سے شکایت ہو گی کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہ گئی ہے۔ یہ مطلب تھا حضرت عمرؓ کے اس اعلانِ گرامی کا کہ میں ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دوں گا کہ تم میں سے کسی کو میرے خلاف شکایت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

آج عزیزانِ من! ہماری حالت یہ ہے کہ ہر شخص سر سے پاؤں تک سراپا شکایت ہے۔ کسی کی زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی نہ کسی معاملہ میں شکایت کے بغیر نہیں گزرتا۔ اور کوئی دروازہ ایسا نہیں جہاں سے شکایت کرنیوالے کو اس کی شکایت کا اطمینان بخش جواب مل سکے۔ اور ایک دور وہ تھا جس میں کسی کو انسانوں سے تو ایک طرف، خدا سے بھی کسی کی شکایت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ نظام ہر ایک کو اس طرح دیتا تھا کہ کسی کو خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے کہ

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

میں اس حقیقت کو ایک بار پھر واضح کر دوں کہ اسلامی مملکت کے وجود میں آنے کی غرض و غایت، یا وجہِ جواز ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ "نشوونما دینے" کو عربی زبان میں "زکوٰۃ" کہتے ہیں۔ دیکھئے، اس ضمن میں قرآن کریم کس قدر واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ..... (۲۲/۴۱) یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں حکومت و مملکت عطا کریں گے تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کریں گے اور نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں "ایتائے زکوٰۃ" کو مملکت کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مروجہ تصور ہے کہ انسان جس قدر چاہے دولت جمع کرتا جائے اور سال کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد کے حساب سے خدا کے نام پر دیدے تو یہ تصور بعد کا پیدا شدہ ہے جو لوگ اپنی ضروریات سے زاید سارے کا سارا دینے کیلئے تکلف ہوں ان کے سال بھر مال جمع رکھنے کے بعد اڑھائی فیصد مانگنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں دولت جمع کرنے کیخلاف اس قدر وعید آئی ہے کہ اسکے پیشِ نظر اسلام میں دولت جمع کرنیکا خیال تک نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان مقامات میں سے صرف ایک مقام کو سامنے لاتا ہوں جس میں قرآن کریم

دولت جمع کرنے کیخلاف

میں دولت جمع کرنے کو سختی سے روکا گیا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔
..... اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۔ جو لوگ چاندی، سونا یعنی دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لئے نہیں دے دیتے، اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی بشارت دیدے یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۔ (۹/۳۴-۳۵) جس دن ان چاندی اور سونے کے سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا، اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو جو کچھ تم نے جمع کر رکھا تھا اس کا مزہ چکھو۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اس قدر واضح احکام اور ایسی الم انگیز وعید کے بعد اسلام میں دولت جمع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور بات بالکل واضح ہے۔ جب مملکت اس امر کا ذمہ لے لے کہ وہ افرادِ مملکت کی اپنی اور ان کی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہے تو پھر دولت جمع کس مقصد کے لئے کی جائے گی؟ اور جب قرآن کے اس حکم پر عمل ہوگا کہ جو کچھ کسی کے پاس زائد از ضرورت ہے اسے مملکت کی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ اس سے نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما مہیا کرے تو فاضل دولت رہے گی کس کے پاس جسے وہ جمع کرے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مسلم کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:

> حضورؐ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال، میرا مال، کہتا رہتا ہے حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر لیتا ہے۔ اور (۳) جو کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے نہ تو عمر بھر کبھی ایک پیسہ تک جمع کیا اور نہ ہی اپنی وفات کے بعد کوئی ترکہ چھوڑا۔ جہاں تک جمع کرنے کا تعلق ہے یہ روایت ہمارے سامنے ہے کہ

> مرض الموت کے دنوں حضورؐ کے پاس چند دینار کہیں سے آئے تھے حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کر دو (یعنی بیت المال میں بھیج دو تاکہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں) لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا۔ وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا۔ جب وہ

اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا (یعنی بیت المال میں بھیج دیا۔

رسولؐ اللہ کا ترکہ

جہاں تک حضورؐ کے ترکہ کا تعلق ہے، بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ

میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ۔ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ

رسول اللہ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ غلام نہ لونڈی۔ اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے خچر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔

واضح رہے کہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، قرآن کریم میں وراثت وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس زمانے سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلامی نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ اور یا پھر ان اشیاء سے متعلق جنہیں اسلامی نظام افراد کی تحویل میں رہنے دے۔ اسلام میں جب تک فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہی نہیں تو اسکا اپنے ترکہ میں مال و دولت یا جائیداد چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے کبھی روپیہ پیسہ جمع کیا۔ نہ کوئی جائیداد بنائی۔ اور نہ ہی اپنے ترکہ میں کچھ چھوڑا۔ ایسا ہی اس نظام میں ہوگا جو "کتاب و سنت" کے مطابق متشکل ہو۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس نظام کی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں صورت یہ اختیار کی گئی تھی کہ تمام افراد جماعت کا سامان خورد و نوش یک جا کر لیا جاتا تھا اور اس میں سے حصہ رسدی ہر ایک کو مل جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نظام ترقی کرتا گیا اور حضورؐ کی حیات ارضی کے آخری زمانہ میں ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ افراد مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ مختلف افراد کے لئے وظائف مقرر کرنے کا

اجرتوں کا معیار

معیار کیا ہو؟ اس باب میں حضورؐ نبی اکرمؐ نے جو اصول تجویز فرمایا جب اس پر کسی ایسے ماہر اقتصادیات کی نگاہ پڑتی ہے جو جانتا ہے کہ یہ مسئلہ کس قدر پیچیدہ اور لاینحل ہے، تو وہ ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے اور بارگاہِ رسالت میں مولانا ظفر علی خاںؒ کے الفاظ میں) یہ کہہ کر اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرنے

پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا، اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

یہ ظاہر ہے کہ اس وقت نظامِ سرمایہ داری سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہا ہے اور اس نظام کے حاملین کی تمام تگ و تاز، رقصِ بسمل اور حرکتِ مذبوحی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس وقت دنیا کے بعض ممالک نظامِ سرمایہ داری کا تختہ الٹ کر اس کے برعکس نظام (اشتراکیت) کے قیام کے لئے مصروفِ جدوجہد ہیں۔ اور جو ہنوز اس حد تک نہیں پہنچے، وہ اپنے ہاں فلاحی مملکتیں (WELFARE STATES) قائم کر رہے ہیں۔ اشتراکی نظام کے علمبردار ہوں یا فلاحی مملکتوں کے قیام کے مدعی، جس مسئلہ نے ان دونوں کو دقتِ اضطراب کر رکھا ہے، یہ ہے کہ کام کرنے والوں کی اجرتیں (WAGES) کس معیار کے مطابق مقرر کی جائیں۔ نام مثال کی رُو سے یوں سمجھئے کہ مزدور کو چار روپے روزانہ اُجرت دی جاتی ہے اور انجینئر کو چالیس روپے روزانہ۔ سوال یہ ہے کہ ان کی یہ اجرتیں کس اصول کے مطابق مقرر کی جاتی ہیں؟ مزدور کو کیوں چار روپے روزانہ دیئے جاتے ہیں اور انجینئر کو کیوں چالیس روپے روزانہ۔ میں اس وقت اس مسئلہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ دنیا اس وقت جس عالمگیر کشمکش میں گرفتار ہے اور جس کی وجہ سے ہر جگہ تخریبی شورشوں کے ہنگامے برپا ہو رہے ہیں اس کی ایک بنیادی وجہ یہی سوال ہے جس کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں مل رہا۔ اس کا حل، آج سے چودہ سو سال پہلے، اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ نے پیش کیا تھا جسے خدا نے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ مملکت کا فریضہ، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہے۔ اس لئے یہ سوال ہی سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ کسی کے کام کا کس قدر معاوضہ دیا جائے۔ ہر فرد کے سپرد کام وہ کیا جائے جس کے کرنے کا وہ اہل ہو۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس کام کو پورا کرے اور مملکت اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ چنانچہ اس کی ابتدا حضورؐ نے مالِ غنیمت کی تقسیم سے کی۔ اس میں سے غیر شادی شدہ سپاہی (مجاہد) کو ایک حصہ ملتا تھا اور شادی شدہ کو دو حصے۔ اور جس کے پاس گھوڑا ہوتا تھا اسے گھوڑے کا حصہ الگ ملتا تھا کیونکہ اس سپاہی کی ضروریات میں گھوڑا بھی شامل تھا۔ لہٰذا اصول یہ طے پایا کہ

ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور مملکت ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی کفیل ہو۔

اور یہی ہے وہ انسانیت ساز، درخشندہ اصول، جسے (ہر سمت سے دھکے کھانے کے بعد) کارل مارکس نے

کارل مارکس کا نظریہ

اپنے نظامِ معیشت میں بطور اساسی نظریہ پیش کیا ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ کارل مارکس کو یہ اصول کہاں سے ملا ہے ۔ اور سب سے زیادہ تعجب ہے خود ہم مسلمانوں پر کہ ہمیں بھی معلوم نہیں کہ روشنی کی یہ کرن کس آفتاب جہاں تاب سے مستعار لی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے برادرانِ عزیز! کہ (جیسا کہ میں نے سلیم کے نام ایک خط میں لکھا تھا) دنیا میں جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے، یہ صدقہ ہے اس سرچشمۂ رحمت کا جسے تمام نوعِ انسانی کے لئے عام کر دیا گیا تھا۔ دنیا، قرآنی اصولوں اور ان کی روشنی میں، محمد رسول اللہ کے ہاتھوں متشکل شدہ نظام کے کسی ایک گوشے کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ مستقبل میں جا کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی مشکلات کا اطمینان بخش حل مل سکتا ہے اور نہ ہی حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بزمِ ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتابِ جہاں تاب کی ضیا باریوں کا تصدق ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے، وہ اسی جانِ بہار کی نکہت بیزیوں کا رہینِ منت ہے۔ کہنے والے نے کس حسین انداز میں کہا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفٰے اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰے است
(جاوید نامہ اقبال)

یہ حقیقت ہے کہ اس قرآنی نظام کے سوا جسے حضورؐ رحمت للعالمین نے تمام دنیا کے لئے وجہ بالعیدگی انسانیت بنایا تھا، انسانی مشکلات کا حل کہیں نہیں مل سکتا۔ اگر چمنِ عالم اس کی نسیمِ سحری سے محروم ہو جائے، تو اس کی تمام سرسبزیاں اور شادابیاں مضمحل کر رہ جائیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

لیکن مارکس نے چونکہ اس نظام میں سے صرف ایک جزو مستعار لیا تھا اس لئے اس کے متبعین کے ہاں ۔

خواہ وہ روس میں ہوں یا چین میں — یہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس لئے کہ نظامِ محمدیؐ کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اسے پورے کا پورا اپنایا جائے تو پھر یہ اپنے انسانیت ساز نتائج سے وجہ شادابیٔ عالم بنتا ہے اور جو نظامِ زندگی، وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار سے انکار پر مبنی ہو، جو اپنا سرِ نیاز اُس حاملِ وحی حضور رسالتمآبؐ کے سنگِ آستاں پر نہ جھکائے، وہ اس کے پیش فرمودہ نظامِ حیات کے کسی ایک حصے کو الگ کر لے جانے سے بھلے انسانیت نہیں بن سکتا۔ دنیا کا کوئی فارمولا بھی لیجئے۔ وہ اپنا نتیجہ اسی صورت میں مرتب کریگا جب اسے بتمام (پورے کا پورا) عمل میں لایا جائے۔ اس کے اجزاء کو الگ الگ کر کے، دوسرے فارمولوں میں پیوندکاری سے حسرت و پشیمانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر توجہ مرکوز کرائی کہ۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا یہ چاہتے ہیں کہ اس ضابطۂ حیات کے بعض اجزاء کو اپنا لیں اور دوسرے اجزاء سے انکار کر دیں۔ ان سے برملا کہہ دو کہ — فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (۲/۸۵)۔ تم میں سے جو کوئی بھی اس روش کو اختیار کریگا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت کے دن بھی شدید ترین عذاب میں مبتلا — جو لوگ آج اسلامی نظامِ حیات یا اسلام کے معاشی نظام کے نعرے بلند کر رہے ہیں، انہیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنی نظام، زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اسے یا تو بالکلیہ اختیار کرنا ہوگا یا بالکلیہ چھوڑ دینا۔ اس کے ان اجزاء کو اپنا کر جن میں اپنا فائدہ نظر آتا ہو، اور باقی اجزاء کو چھوڑ کر، یا ان کی فریب کارانہ تاویلات سے، آپ کچھ وقت کے لئے لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہیں، وہ ثمرات پیدا نہیں کر سکتے جو اس شجرِ طیب کا فطری حاصل ہیں۔

بہرحال، عزیزانِ گرامی قدر! میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ مملکت نے اپنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے۔ اس پروگرام کا آغاز تو خود حضورؐ کی زندگی میں ہو گیا تھا، لیکن اس کی تکمیل آپؐ کے جانشین حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں ہوئی۔ وظائف مقرر کرنے کے وقت بعض گوشوں سے یہ تجویز آئی کہ جن لوگوں نے جس قدر زیادہ کام کئے ہیں، انہیں اسی نسبت سے زیادہ وظیفہ دیا جائے۔ آپ نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ حضور نبی اکرمؐ کے اختیار فرمودہ اسی اصول کی تفسیر تھی جس کا ذکر میں، پہلے کر چکا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ

جن حضرات کی خدمات آپ گنا رہے ہیں، انہیں ان کا اجر خدا کے ہاں سے

ملیگا۔ ہم معاش تقسیم کر رہے ہیں اور یہ تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

(کتاب الخراج ۔ قاضی ابو یوسف)

ضرورتوں کا تعین

آج کا مسلمان جو اس نظام کے اجزاء کو الگ الگ دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے جھٹ سے یہ سوال سامنے لے آتا ہے کہ یہ اصول بیشک نہایت منصفانہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے لیکن سوال یہ ہے کہ مختلف افراد کی ضرورتوں کا تعین کون کرے گا؟ یہ بڑے بڑے لوگ جن کے ہاتھوں میں رزق کی تقسیم ہوگی، اپنی ضروریات کی لسٹیں ایسی مرتب کرینگے کہ اس کے بعد بیچارے غریبوں کے لئے کچھ بھی نہ بچیگا اور ان کی حالت خراب سے خراب تر ہو جائیگی۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے یہ خدشہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس نظام کے اجزاء کو الگ الگ دیکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس نظام کو بالکلیہ اپنایا تھا، دیکھئے کہ انہوں نے اپنی ضروریات کو کس طرح متعین کیا تھا۔ مملکت میں سب سے زیادہ صاحب اختیار ہستی سربراہ مملکت کی ہوتی ہے۔ اس مملکت کے سب سے پہلے سربراہ (حضور رسالتمآبؐ) کی زندگی کی ایک جھلک پہلے سامنے لائی جا چکی ہے۔ روکھی سوکھی روٹی۔ ایک جوڑہ کپڑا۔ نہ کوئی مکان، نہ جائیداد، نہ بنک بیلنس۔ نہ ترکہ ۔۔۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس مملکت کی وسعتیں بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ اور اسی نسبت سے مال و دولت کی فراوانیاں بھی حیرت انگیز حد تک بڑھ گئی تھیں۔ اس مملکت کے سربراہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ مملکت کی آمدنی میں سے آپ کے لئے کس قدر لینا جائز ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ

> کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک جاڑے کا دوسرا گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام، اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال۔
>
> (عمر فاروق ۔ از محمد حسین ہیکل مرحوم)

اور اس کھانے کی تفصیل میں اس سے پہلے بھی متعدد بار آپ احباب کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ لیکن وہ بات ایسی بنیادی اور اہم ہے کہ اسے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے ۔۔۔ بالخصوص اس زمانے میں، جبکہ کیفیت یہ ہو چکی ہے، ہر لوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۔۔۔ ہر سمت سے اسلامی نظام کے دعوے ابھر رہے ہیں اور کوئی متعین طور پر نہیں بتاتا کہ اس سے ان کا مفہوم کیا ہے ۔۔۔ وہ تفصیل یہ ہے کہ ایک دفعہ مصر کا گورنر آیا تو حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھانے میں جَو کی روٹی ہے۔ اس نے کہا کہ اب تو مصر

سے کافی تعداد میں گیہوں آرہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ نے کہا کہ اس وقت مجھے اس کا تو یقین ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو جَو کی روٹی میسر آرہی ہے جس دن تم مجھے اس کا یقین دلا دو گے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے، اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھالوں گا۔

جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کرکے اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈال رہے ہیں تو اس کا جو جواب آپ نے دیا وہ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ بلکہ اس کے ارباب نظم و نسق میں سے ہر ایک کے احساسِ ذمہ داری کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

میں رعایا کی دیکھ بھال کس طرح کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر وہی کچھ نہ بیتے جو کچھ رعایا پر بیتتی ہے۔ (ہیکل)

"رعایا" کے لفظ سے آپ کا ذہن "حاکم و محکوم" کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ اسلامی نظام میں حاکم و محکوم کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس لفظ ــــ رعایا ــــ کا ترجمہ (SUBJECTS) دورِ ملوکیت کی ایجاد ہے۔ اصل کے اعتبار سے راعی کے معنی ہوتے ہیں چرواہا، اور رعیت اس گلہ (FLOCK) کو کہتے ہیں جس کی دیکھ بھال، پرورش، حفاظت کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے ــ یہ ہوتا ہے قرآنی نظام میں افرادِ مملکت اور اس کے سربراہ کا باہمی تعلق۔ اور اس ذمہ داری کے لئے وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا یہی وہ احساس تھا جس کا اظہار قرآن میں حضور نبی اکرمؐ کی لسانِ مبارک سے ان الفاظ میں کرایا گیا کہ

قُلْ - اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۱۰/۱۵)

ان سے کہہ دو۔ اعلان کر دو۔ کہ اگر میں بھی خدا کے حکم سے سرتابی برتوں، تو مجھے بھی خدا کے محاسبہ اور مواخذہ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی اس کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔

یہی وہ احساس تھا جس کی بنا پر حضورؐ نے، اپنی زندگی کے آخری سانس میں، یہ دریافت کیا تھا کہ گھر میں زائد از ضرورت کوئی پیسہ تو نہیں۔ اور جب معلوم ہوا کہ ابھی ابھی کچھ دینار کہیں سے آئے ہیں تو جب تک انہیں بیت المال میں نہیں بھجوا دیا، دنیا سے تشریف نہیں لے گئے۔ اور حضرت عمر فاروقؓ کو اپنی کٹتی ہوئی انتڑیوں کی تکلیف کی شدت اتنا نہیں ستا رہی تھی جتنا یہ احساس کہ جو ذمہ داریاں میرے سپرد کی گئیں تھیں، معلوم نہیں معیارِ خداوندی کے مطابق ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ چنانچہ ان کی حالت یہ تھی کہ گھاس کا سوکھا ہوا

تنکا اٹھاتے اور انتہائی کربِ الم کے عالم میں کہتے تھے کہ اے کاش! میں عمر نہ ہوتا۔ گھاس کا یہ تنکا ہوتا، کہ خدا کے محاسبہ سے محفوظ رہتا —— اور یہی ہے وہ بنیاد جس پر اسلامی نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی یہ احساس کہ

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

(○)

یہ ہے عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق 'رزق کی محمدی تقسیم' —— یعنی
خدا کے عطا کردہ رزق کی اس طرح تقسیم کہ کسی شخص کو اس کی ضرورت
سے زیادہ نہ ملے اور کسی شخص کی ضروریاتِ زندگی رُکی نہ رہیں۔

ارضی جنت

یہی وہ (اس دنیا میں) جنتی زندگی ہوگی جس میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہوگا نہ محتاج جس میں یہ کیفیت نہیں ہوگی کہ ایک کے کتے دودھ اور گوشت پر پلیں اور دوسرے کے بچوں کو روٹی کا سوکھا ٹکڑا تک نصیب نہ ہو۔ ایک کے محلات آسمان سے باتیں کریں اور دوسرے کے پاس سر چھپانے کے لئے جھونپڑی تک نہ ہو۔ ایک کی بیگمات کے صندوق حریر و اطلس کے زربفت ملبوسات سے بھرے پڑے ہوں اور دوسرے کو یہ غم کھائے جا رہا ہو کہ جوان بیٹی کو گھر سے وداع کس طرح کروں، کہ اس کا سر ڈھانپنے کے لئے چادر تک میسر نہیں۔ ایک کا مقبرہ سنگِ مرمر کی خبست کاری سے رشکِ فردوس بن رہا ہو اور دوسرے کی بیوہ اس غم سے نڈھال ہو کہ لاش کو ڈھانپنے کے لئے کفن کہاں سے لاؤں —— نہیں' رزق کی محمدی تقسیم میں یہ نہیں ہوگا —— اس تقسیم کا نتیجہ اس دنیا میں جنت کی زندگی ہوگی جس میں دودھ کی نہریں بہیں گی۔ درخت پھلوں سے لدے ہونگے۔ حریر و اطلس کے ملبوسات ہوں گے۔ چاندی اور سونے کے برتن اور بلوریں گلاس اور کنٹر ہونگے۔ اعلیٰ درجے کے قالین اور بہترین صوفے ہوں گے۔ —— لیکن یہ سارا سامانِ آسائش و آرائش ہر ایک کے لئے یکساں ہوگا۔ آپ سارے قرآن کو دیکھ جایئے۔ اس میں کہیں یہ نہیں دکھائی دے گا کہ جنت کا ساز و سامان' ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص ہوگا، اور عام لوگوں کی زندگی کچھ اور ہوگی —— نہیں۔ جنت میں طبقاتی تقسیم نہیں ہوگی۔ اس میں جو کچھ ہوگا سب کے لئے یکساں ہوگا۔ یہ وہ مقام ہوگا جس میں یہ حقیقت عملاً سامنے آجائے گی کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

—— اور زندگی کا یہی نقشہ' اس دنیا میں' رزق کی محمدی تقسیم سے ہوگا۔ اسی کو اسلام کا

معاشی نظام کہتے ہیں۔

لیکن اس نظام کو قائم اسی انداز سے کیا جائیگا جس انداز سے اسے حضور نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ جب حضورؐ نے اس دعوت کو پیش فرمایا تو اسوقت مسلمانوں کی اپنی مملکت ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی اسلئے اسے انفرادی صدقہ خیرات، انفاق کی ترغیب سے شروع کیا گیا اور بتدریج اس مقام تک پہنچایا گیا جہاں مملکت نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیا۔ اسوقت نہ کسی کے پاس کچھ ذاتی ملکیت میں تھا اور نہ ہی مملکت میں کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا تھا۔ لیکن ہماری پوزیشن اس سے مختلف ہے۔ ہماری اپنی آزاد مملکت ہے جسے ہم نے حاصل ہی اسلامی نظام قائم کرنے کیلئے کیا تھا اور اسی نظام کے قیام کی آوازیں آج ہر سمت سے اٹھ رہی ہیں۔ لہذا آج ہم اس قابل ہیں کہ اس نظام کو مملکتی سطح پر آئین و قوانین کی رو سے قائم کرسکیں۔

پس چہ باید کرد؟

لیکن آج جہاں ایکطرف ہمیں یہ (ADVANTAGE) حاصل ہے کہ ہماری اپنی آزاد مملکت ہے دوسری طرف یہ (DISADVANTAGE) بھی ہے کہ حضورؐ نے جس امت کی تشکیل فرمائی تھی جسکے ہر فرد نے از خود معاہدہ اپنے جان اور مال کو مملکت خداوندی کے ہاتھوں بیچ رکھا تھا۔ اور ہم مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھوں بیچ دینا تو ایکطرف ہمیں اسکا علم تک بھی نہیں کہ مسلمان ہونے کی یہ شرط بھی ہے۔ اسلئے آئین و قوانین کی رو سے اس نظام کے قیام کیساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی آنیوالی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں کہ اس نظام کے قیام اور استحکام کا تقاضا انکے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو...

لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا۔ یعنی نہ اس نظام کے قیام کیلئے عملی قدم اٹھایا اور نہ ہی نونہالانِ ملت کی صحیح تعلیم کا انتظام کیا، تو پھر وہ اسکے تقاضے خاموش تماشائی بنکر نہیں بیٹھے رہینگے۔ وہ موجودہ نظام کی بساط الٹنے کیلئے حشر بنکر اٹھینگے اور سیلاب بنکر امنڈ آئینگے۔ اور پھر جو کچھ ان کے سامنے آئیگا اسے تباہ و برباد کرکے رکھ دینگے۔ یہی ہے وہ حقیقت کبریٰ جسے قرآن کریم نے ایسے واضح انداز میں بیان کیا ہے جسے دیکھکر روح پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ... اے جماعت مومنین! تم اللہ اور رسول کی اس آواز پر لبیک کہو جو تمہیں ایک حیات بخش نظام کے قیام کیلئے دعوت دیتی ہے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵) تو پھر تم اس فتنہ سے ڈرو جو جب آیا کرتا ہے تو انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتا جو ظالم اور کاسہ لیس ہوتے ہیں وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کا مواخذہ بڑا سخت ہوتا ہے۔

اقبال کی تمثیل

یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں یوں واشگاف کیا ہے کہ پہلے اسٹیج پر نظامِ سرمایہ داری کا ستایا ہوا ابلیس نمودار ہوتا ہے اور نہایت دکھ بھرے دل سے خدا سے پوچھتا ہے کہ

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

تو اس آدم کا معبود نہیں رہا۔ اس آدم کی تو کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

وہ خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اور آخر میں انتہائی کرب و الم سے چیخ کر پکارتا ہے کہ

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اس پر خدائے قادر و عادل خاموش نگاہوں سے فرشتوں کیطرف دیکھتا ہے اور بے صوت صدا سے ان سے پوچھتا ہے کہ تم بتاؤ کہ کرۂ ارض

یہ ابن آدم کی حالت کیا ہے؟ وہ نہایت ادب سے سر جھکائے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ حضور! حقیقت تو وہی ہے جیسے لینن نے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ؎

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی!
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

اس پر خدا کا قانونِ مکافات آگے بڑھتا ہے اور انتہائی جلال انگیز انداز سے کہتا ہے کہ اگر انسانوں کی کوئی جماعت ایسی نہیں اٹھتی جو جہل کے اس انسانیت سوز نظام کی جگہ وحی کی راہ نمائی میں نظامِ خداوندی قائم کردے تو یاد رکھو پھر فطرت کی قوتیں آندھی اور جھکڑ بنکر اٹھینگی اور جو کچھ انکے سامنے آئیگا اسے تہ و بالا کرکے رکھ دینگی۔ اسے اقبال نے "فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی" کے عنوان سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ حالت اگر یہی ہے تو پھر

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

یاد رہے کہ اس میں "فرشتوں" سے مراد کائناتی قوتیں یا زمانے کے تقاضے ہیں اور فرمانِ خداوندی سے مراد خدا کا قانونِ مکافات۔ ان تقاضوں سے مجبور ہو کر عوام اٹھ کھڑے ہونگے اور ہر روشِ کہن کو پامال کرکے رکھ دینگے۔

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اس سے فساد برپا ہوگا اور یہ ذہنیت ابھریگی کہ جس سامانِ زیست سے غریب اور محنت کش محروم رکھے جاتے ہیں۔ وہ سامانِ زیست باقی نہ رہے تو اچھا ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

باطل کا سرمایہ دارانہ نظام، مذہبی پیشوائیت کی فریبکارانہ افیون کے سہارے قائم رہتا ہے اسلئے سب سے پہلے انہیں راستے سے ہٹاؤ۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

ان مذہبی پیشواؤں کی حالت یہ ہے کہ — حق را بسجودے صنماں را بطوافے — اسلئے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو۔

اقبال کے سامنے وہ فساد اور خلفشار تھا جو روس میں برپا ہوا تھا۔ اسلئے اس نے مختلف انداز سے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اگر تم نے رزق کی منصفانہ تقسیم نہ کی تو یاد رکھو یہی کچھ تمہارے ہاں بھی ہوگا اور یہ تنبیہ اقبال کی تنبیہ نہیں تھی۔ تغیراتِ زمانہ کے اس عظیم شعور شناس (صلعم) کی تنبیہ تھی جو علم کائنات کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھا۔ اس تنبیہ کو حضورؐ نے ایک نہایت دلنشیں مثال کی رُو سے یوں بیان فرمایا تھا کہ

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا! ہم کشتی میں سوراخ کرکے پانی حاصل کر لینگے۔ اب اگر نیچے والوں کو یہ کہہ کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائینگے۔ اگر انہیں بھی پانی لینے دیا جائے تو سب بچ جائینگے۔ (ترمذی)

اس حدیث میں (اور اقبال کی نظم "فرمانِ خداوندی" میں) نیچے والوں کو اس کی تلقین نہیں کی گئی کہ وہ کشتی میں چھید کرکے اسے ڈبونے کا سامان کریں۔ اس میں اوپر والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دیں کہ نیچے والے تنگ آکر اس قسم کی حماقت کر بیٹھیں جس سے نہ تم رہو نہ وہ رہیں۔ اور نہ ہی کشتی باقی رہے۔

کیا کشتیٔ پاکستان کا کوئی ایسا بھی خواہ ہے جو نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظمؐ کی اس لرزہ انگیز تنبیہ پر کان دھرے اور اس کشتی کو ڈوبنے سے بچالے؟ جو ایسا کریگا وہی کتابِ خداوندی کا صحیح پیرو اور سنتِ نبویؐ کا سچا متبع ہوگا۔ اگر ایں نہ رسیدی تمام بولہبی است!

رفیع اللہ

علماءِ کرام ــــ امام غزالیؒ کی نگاہوں میں

[آپ تاریخ انسانیت پر ایک نگاہ ڈالیے۔ ہر دور، ہر مقام اور ہر قوم میں ایک چیز بطور قدرِ مشترک سامنے آئے گی اور وہ یہ کہ (قلیل ترین مستثنیات کو چھوڑ کر) انسان ہمیشہ "خدا پرست" رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خدا کا تصور (وحی کی تعلیم کو چھوڑ کر) ہر جگہ مختلف رہا ہے۔ لیکن 'اپنے اپنے تصور کے مطابق' انسان ہمیشہ "خدا پرست" رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ دوسری چیز بطور قدرِ مشترک یہ ملے گی کہ ہر دور، ہر مقام اور ہر قوم میں ایک گروہ ہمیشہ موجود رہا ہے جس نے انسان کے اس جذبۂ خدا پرستی کو (EXPLOIT) کیا ہے۔ اس گروہ کو مذہبی پیشوائیت (PRIESTS) کہا جاتا ہے۔ دوسروں کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرنا اور معاشرہ میں فتنہ و فساد برپا کرتے رہنا' ان کا شعار رہا ہے۔ اس باب میں کہیں کوئی استثناء نہیں ملے گا۔ اس شعارِ زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی سیرت ہر قسم کے اخلاقی عیوب و ذمائم کا مرقع بن کر رہ جاتی ہے۔

اور تاریخ میں یہ چیز بھی التزاماً نظر آئے گی کہ جن لوگوں کے دل میں انسانیت کا درد تھا انہوں نے اس (مذہبی پیشواؤں کے) گروہ کی سیرت و کردار کے خلاف ہمیشہ تنقید کی۔ لیکن ان لوگوں نے ایک ایسا حربہ وضع کیا جس سے اس قسم کی تنقیدات کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ وہ حربہ یہ تھا کہ ان لوگوں نے یہ خیال عام کر دیا کہ ہر گروہ، ہر جماعت اور ہر فرقہ میں کالی بھیڑیں موجود ہوتی ہیں۔ تنقید نگار جو کچھ کہتے ہیں' وہ بجا اور درست سہی۔ لیکن یہ تنقید "ہمارے" خلاف "نہیں۔ کالی بھیڑوں کے خلاف ہے ــــ اور یہ کبھی کسی نے نہ بتایا کہ وہ کالی بھیڑیں ہیں کون سی؟ نتیجہ یہ کہ ان کے خلاف سخت سے سخت تنقیدیں بھی ہوتی رہیں اور یہ گروہ بدستور اپنی من مانیاں بھی کرتا رہا۔

جب اسلام' دین کے بجائے مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس میں بھی مذہبی پیشوائیت کا گروہ نمودار ہو گیا۔ اس گروہ کی خصوصیات بھی وہی تھیں جو دیگر مذاہب کی مذہبی پیشوائیت کا لازمہ تھیں۔ جب ان کے خلاف

تنقیدات کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے بھی وہی حربہ استعمال کیا جو شروع سے استعمال ہوتا چلا آرہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تنقید "علماءِ سوء" کے خلاف ہے۔ "علمائے حق" اس سے مبرا ہیں۔ اور اس کے بعد ان میں سے ہر ایک نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب دے لیا کہ ہمارا شمار "علمائے حق" میں ہوتا ہے۔ "علمائے سوء" کسی اور دنیا میں بسنے ہیں۔ نتیجہ وہی کہ ان کے خلاف تنقیدیں ہوتی رہیں، اور یہ گروہ بدستور دندناتا چلا گیا۔ یہ ایسے ہی ہوا جیسے ان لوگوں نے یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے۔ ان میں سے بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں — اور اس کے بعد ہر فرقہ نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ 'ایک' ناجی فرقہ ان کا ہے باقی سب فرقے جہنمی ہیں۔ اس طرح تہتر کے تہتر فرقے (بزعم خویش) جنتی بن گئے۔

امام غزالیؒ اور ان کی کتاب 'احیاء علوم الدین' کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے اپنی اس مشہور تصنیف کی جلد اول کا ایک پورا باب علماء کے خلاف تنقید کے لئے وقف کر دیا ہے۔ تنقید بڑی سخت ہے لیکن بے ہدف کہ انہوں نے خود ہی انہیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے جیسا کہ اس باب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اس باب کا عنوان ہے۔

فی آفات العلم وبیان علامات علماء الآخرۃ والعلماء السوء۔

ہمارے محترم رفیع اللہ صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے اس باب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جسے ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انہیں کم از کم اس کا علم ہو جائے کہ جو خرابیاں علماء کے گروہ میں دکھائی دیتی ہیں، وہ ہمارے زمانے کے علماء کا خاصہ نہیں۔ علماء کی شروع ہی سے یہ حالت چلی آرہی ہے۔ (امام غزالیؒ کی وفات ۱۱۱۱ء میں ہوئی تھی) اصل یہ ہے کہ علماء کے خلاف تنقید افراد کو سامنے رکھ کر نہیں ہونی چاہیئے — علماء بھی بالآخر انسان ہیں۔ اور انسانوں میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ علماء کے خلاف تنقید در حقیقت مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی (INSTITUTION) کے خلاف تنقید ہونی چاہیئے جس کا وجود "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودے" کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ یہ انسٹی ٹیوشن ہی خلاف اسلام ہے اس لئے ان میں اگر کچھ لوگ انفرادی طور پر اچھے بھی ہیں تو اس سے یہ انسٹی ٹیوشن تنقید سے بالا نہیں ہو سکتی۔ یہ پھر بھی بدستور خلاف اسلام رہے گی اور یہ خرابی ایسی بنیادی اور سنگین ہے کہ کسی کی انفرادی خوبیاں اس کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔

بہرحال امام غزالیؒ کی کتاب احیاء علوم الدین کے چھٹے باب کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے (یہ بڑا طویل ہے اس لئے اقساط میں شائع ہوگا)۔ احیاء علوم الدین کے متعلق اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس میں ایسی ایسی رکیک روایات بھی درج ہیں جن کی حیثیت افسانوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ زیرِ نظر باب میں بھی اس قسم کی روایات

سامنے آئیں گی۔ حلقۂ طلوع اسلام میں، بفضلِ ایزدی، ایسی بصیرت بالعموم پیدا ہو چکی ہے کہ وہ رطب اور یابس میں تمیز کر سکیں۔ اس لئے اس قسم کی روایات پر تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ طلوع اسلام]

(۰)

علم بلا عمل ایک خطرہ ہے

علم اور اہل علم کے فضائل کے سلسلے میں شریعت میں جو کچھ وارد ہوا ہے اسے ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں۔ علمائے باطل کے بارے میں شریعت حقہ میں بڑے سخت احکام آئے ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن دوسری تمام مخلوق سے زیادہ عذاب کے سزاوار یہی علمائے باطل ہیں۔ اس لئے علمائے حق اور علمائے باطل کی پہچان ایک اہم اور ضروری معاملہ ہے۔ یہ علمائے باطل وہ علمائے دنیا ہیں جن کے نزدیک دینی علوم کا مقصد دنیاوی عیش و عشرت ہے اور اسکے ذریعے اہل دنیا کے نزدیک جاہ و مرتبہ حاصل کرنا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ قیامت کے دن تمام لوگوں سے سخت عذاب اس عالم دین کو ہوگا جسے اس کے دینی علم نے کوئی نفع نہ دیا۔ اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک کوئی عالم دین اپنے علم پر خود عمل نہیں کرتا اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں عالم تصور نہیں ہوتا۔ اور آپؐ نے فرمایا، کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زبان کا علم جو اللہ تعالےٰ کی مخلوق پر حجت ہے اور دوسرا علم قلبی جو مفید علم کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک روایت میں آپؐ سے منقول ہے کہ آخر زمانہ میں عبادت گزار جاہل ہوں گے اور علماء فاسق ہونگے۔

ایک دوسرے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا کہ علم دین اس لئے حاصل نہ کرو کہ تم علماء کے ساتھ فخر کرو اور بیوقوف لوگوں کے ساتھ بحث مباحثے کرو تاکہ لوگ تمہاری طرف متوجہ ہوں۔ تو جو کوئی اس مقصد کے لئے علمِ دین حاصل کرے گا، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔ اور آپؐ نے فرمایا۔ کہ جس نے علم دین کو چھپایا، قیامت کے دن اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ ایک اور روایت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے امت مسلمہ کے سلسلہ میں دجال کی نسبت غیر دجال سے زیادہ خوف ہے۔ آپؐ سے جب اس کی وضاحت پوچھی گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ غیر دجال گمراہ کرنے والے ائمہ دین ہیں۔ ایک اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس عالم دین کا علم ہدایت سے زیادہ دور ہوگا وہ اللہ تعالےٰ سے اتنا ہی دور ہوگا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ تم کب تک آخر شب میں چلنے والوں کے لئے راستہ صاف کرتے رہو گے اور خود حیرت زدہ لوگوں کے ساتھ کھڑے رہو گے۔ یہ احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ علم دین ایک بڑا خطرہ ہے کہ اس کا حاصل کرنے والا یا تو سعادت جاوید حاصل کر لیتا ہے، یا ہمیشہ کے لئے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

منافق عالم دین

ان احادیث کے علاوہ اس بارے میں سلف صالحین سے بھی بہت سے اقوال منقول ہیں۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے امت مسلمہ کے متعلق منافق عالم دین سے

زیادہ خطرہ ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ایک منافق کیسے عالمِ دین ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ زبان کا عالم اور دل اور عمل کے لحاظ سے جاہل اور حسن رحمۃ اللہ علیہ (جو ایک صوفی بزرگ تھے) کا قول ہے کہ تم ان علمائے دین میں سے نہ ہونا جو علم و حکمت تو بہت جمع کرتے ہیں لیکن عمل وہ بیوقوفوں کی طرح کرتے ہیں۔ ایک آدمی نے حضرت ابوہریرہؓ سے کہا کہ میں علمِ دین حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے خطرہ ہے کہ کہیں اسے ضائع نہ کر بیٹھوں تو آپ نے فرمایا کہ جب تم اسے چھوڑ بیٹھو گے تو یوں سمجھو کہ ضائع کر دو گے۔ اور حضرت ابراہیم بن عیینہ سے دریافت کیا گیا کہ کس شخص کی ندامت سب سے زیادہ ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس دنیا میں تو سب سے زیادہ ندامت اس شخص کو ہوتی ہے جو کسی ایسے شخص پر احسان کرے جو اس کا شکریہ تک ادا نہ کرے اور موت کے بعد سب سے زیادہ شرمندہ عمل میں کوتاہی کرنے والا عالمِ دین ہوگا۔

اور خلیل بن احمد نے فرمایا کہ آدمی چار قسم کے ہیں۔ پہلا آدمی وہ صاحبِ علم ہے جو اپنے علم سے اچھی طرح واقف ہے۔ تو یہ ہے وہ عالم جس کی تابعداری کی جائے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو صاحبِ علم تو ہے لیکن اپنے علم سے بے خبر ہے تو یہ سویا ہوا ہے۔ اسے جگانے کی ضرورت ہے۔ اور تیسرا آدمی وہ لاعلم شخص ہے جو اپنی لاعلمی سے آگاہ ہے تو یہ قابلِ ہدایت ہے، اسے ہدایت کا راستہ دکھاؤ۔ اور چوتھا آدمی وہ لاعلم ہے جو اپنی لاعلمی سے بھی آگاہ نہیں تو یہ شخص جاہلِ محض ہے۔ اس کے قریب نہ جاؤ۔ اور امام سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ علم عمل عمل پکارتا ہے۔ اگر عمل جواب دے۔ یعنی صاحبِ علم آدمی اپنے علم کے مطابق عمل کرنا شروع کر دے تو ٹھیک ورنہ علم رخصت ہو جاتا ہے۔ اور ابن المبارک فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص طلبِ علم میں رہتا ہے تو اس وقت تک وہ عالم ہی ہوتا ہے اور جب اس کو یہ گمان غالب ہو جاتا ہے کہ میں نے تو سب علم حاصل کر لیا ہے تو وہ جاہل کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

بے عمل عالم پر عذاب

فضیل ابن عیاض ؒ فرماتے ہیں کہ مجھے تین اشخاص پر بڑا ترس آتا ہے۔ ایک وہ شخص جو اپنی قوم میں باعزت تھا لیکن کسی وجہ سے ذلیل ہو گیا۔ دوسرا وہ شخص جو دولت مند تھا اور اسے مفلسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور تیسرا وہ عالمِ دین جو دنیادار لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ اور جناب حسنؒ نے فرمایا کہ دل کا مرجانا بھی علماء پر عذاب کی ایک قسم ہے اور دل کی موت یہ ہے کہ علمِ دین سے دنیاوی فوائد طلب کئے جائیں۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالمِ دین کو ایسا سخت عذاب دیا جائے گا کہ تمام اہلِ دوزخ اسکے عذاب کی سختی دیکھ کر اس کے ارد گرد اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس سے مراد بدکار عالمِ دین ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن ایسے عالمِ دین

کو لایا جائے گا اور اسے آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا جس سے اس کی انتڑیاں نکل پڑیں گی۔ وہ ان کو لئے ایسا گھومے گا جس طرح گدھا چکی کے ارد گرد گھومتا ہے تو تمام اہل دوزخ اس کے ارد گرد اکٹھے ہو کر اس کا حال پوچھیں گے تو وہ جواب دے گا کہ میں دوسروں کو تو نیکی کی دعوت دیتا تھا لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اور دوسروں کو برائی سے روکتا تھا لیکن خود اس کا ارتکاب کرتا تھا اور نافرمانی کے سبب سے عالم دین کے عذاب میں اضافے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے علم رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہونگے اس لئے کہ انہوں نے علم کے باوجود انکار کیا۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو نصاریٰ سے بدتر قرار دیا حالانکہ وہ تثلیث جیسے شرکیہ عقیدے کے قائل نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے علم کے باوجود حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

بَلعام بن باعوراء کا قصہ

اور باری تعالیٰ بَلعام بن باعوراء کے قصے کے سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي ..... الخ اور انہیں اس شخص کا حال سنا دیجئے جسے ہم نے اپنی آیات دیں اور اس نے انہیں چھوڑ دیا اور پھر شیطان نے اس کا پیچھا کیا اور وہ گمراہوں سے ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے اسے بلند کر لیتے لیکن وہ زمین پر آگرا۔ اور اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ تو اس کی مثال اس کتے جیسی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تو بھی وہ ہانپے، اور اگر نہ لادے تو بھی ہانپے۔

پس یہی حال بدکار عالمِ دین کا ہے۔ بلعام کو بھی کتاب اللہ ملی تھی لیکن وہ شہوت کی پستیوں میں گر گیا۔ اس لئے اسے کتے کے ساتھ تشبیہ دی گئی کہ اس سے کوئی فرق نہ پڑا کہ اس کو حکمت ملی یا نہ ملی کیونکہ وہ شہوات کی طرف ہانپتا ہے۔ اور عیسٰے علیہ السلام نے فرمایا[1] کہ علمائے باطل کی مثال ایسی ہے جیسے دریا کے دہانے پر کوئی چٹان گر جائے کہ نہ تو وہ خود پانی پیتی ہے اور نہ ہی کھیتوں کے سیراب ہونے کے لئے پانی بہنے دیتی ہے۔ اور علمائے باطل کی مثال گندے نالے جیسی ہے کہ باہر سے تو چونے سے پختہ بنا لیا گیا ہے لیکن اس کے اندر بدبو ہے۔ اور ان کی مثال ان قبروں جیسی ہے جو اوپر سے تو آباد ہیں لیکن ان کے اندر مردوں کی ہڈیاں ہیں۔ ان احادیث و آثار سے واضح ہوتا ہے کہ دنیادار عالمِ دین جاہل سے بھی زیادہ خستہ حال اور سخت عذاب میں ہوگا۔

علمائے حق کی پہچان

اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کامیابی اور قربت حاصل کرنے والے علمائے حق

---

[1] قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

ہیں اور ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ علم دین کے بدلے دنیاوی مفادات طلب نہ کریں۔ علمائے حق کا کم سے کم درجہ ہے کہ دنیا کی حقارت، خست، اور دشمنی اور ناپائیداری ان پر روشن ہو۔ اور آخرت کی عظمت دوام اور اس کی نعمتوں کی پاکیزگی اور اس کی سلطنت کی بڑائی پر ان کو یقین ہو۔ اور انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ضد ہیں[1]۔ بلکہ ان کی مثال دو سوکنوں جیسی ہے کہ جب ایک کو راضی کرو تو دوسری ناراض ہو جائے۔ اور یہ کہ دنیا اور آخرت ترازو کے دو پلڑوں کی مانند ہیں کہ ان میں سے جب ایک جھکے گا تو دوسرا اتنا ہی اونچا اٹھے گا۔ اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہے کہ جتنا ایک کے قریب ہوگے اتنا دوسرے سے دور ہوگے۔ اور یہ کہ دنیا اور آخرت ان دو پیالوں کی مانند ہے کہ ان میں سے ایک بھرا ہوا ہے اور دوسرا خالی ہے۔ کہ اس بھرے ہوئے میں سے جتنا کچھ خالی پیالے کو بھرنے کے لئے ڈالو گے تو بھرا ہوا پیالہ خالی ہو جائے گا۔ پس جو شخص دنیا کی دشمنی اور حقارت اور یہ کہ اس کا مزہ کڑوہ ہے اور جو صاف بھی ہے تو چند روزہ ہے' کی حقیقت سے بے خبر ہے تو ایسے شخص کی عقل میں فساد ہے کیونکہ مشاہدہ اور تجربہ اس حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے تو ایسا بے عقل شخص علماء میں سے کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو شخص آخرت کی عظمت دوام سے بیگانہ تو وہ ایسا کافر ہے جس کا ایمان اس سے چھین لیا گیا ہے اور جس شخص کا سرے سے ایمان ہی نہ ہو تو بھلا وہ علمائے دین میں سے کیسے ہو سکتا ہے!۔ اور جو شخص اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان دونوں کا جمع کرنا ایک بے فائدہ لایعنی کے سوا کچھ نہیں تو وہ تمام انبیاء کی شریعتوں سے بے خبر ہے۔ بلکہ وہ قرآن مجید کا اول سے لیکر آخر تک انکاری ہے۔ تو ایسے شخص کا شمار کس طرح علمائے دین میں ہو سکتا ہے۔

شیطان کا قیدی

اور جو شخص مذکورہ بالا حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود آخرت کو دنیاوی زندگی پر ترجیح نہیں دیتا تو وہ شیطان کا قیدی ہے جسے اس کی شہوت نے ہلاک کر دیا اور اس کی بدبختی اس پر غالب آگئی۔ تو جن صاحبان کا یہ درجہ ہو ان کو علماء کی جماعت میں کس طرح شمار کیا جا سکتا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے حالات میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ جب کوئی عالم دین میری محبت پر اپنی شہوت کو ترجیح دیتا ہے تو میں اس کو اپنی مناجات کی لذت سے محروم کر دیتا ہوں۔ سو تم میری کیفیت اس عالم دین سے دریافت نہ کرنا جسے دنیاوی عیش نے مست کر دیا ہو۔ وہ تجھے میری محبت سے روک دے گا۔ ایسے علمائے دین تو میرے بندوں کے حق میں ڈاکو اور رہزن ہیں اور جب تو کسی کو

---

[1] یہ ساری راہبانہ تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ (طلوع اسلام)

میرا طالب دیکھے تو اس کا خدمتگار بن جا۔ اور جب کوئی کسی بھاگے ہوئے بندے کو دوبارہ میری طرف لوٹا لیتا ہے تو میں اسے جھبذ(بڑا ہوشیار اور خبردار) قرار دیتا ہوں اور جب کسی کو اس زمرے میں شامل کر لیتا ہوں تو وہ ہمیشہ کے لئے عذاب الٰہی سے بچ جاتا ہے۔ اسی لئے جناب حسنؓ نے فرمایا ہے کہ علماء کے دلوں کا مردہ ہونا ان پر عذاب ہی کی ایک قسم ہے۔ اور دل کی موت حق کے بدلے دنیاوی مفاد حاصل کرنے کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔ اور یحیی بن معاذ الرازیؒ فرماتے ہیں کہ جب علم دین کے بدلے دنیا طلب کی جاتی ہے تو علم و حکمت کی چمک جاتی رہتی ہے۔

عالم دین اور چور

اور حضرت سعید بن المسیبؒ نے فرمایا کہ جب تم کسی عالم دین کو حاکموں کے آگے پیچھے پھرتے دیکھو تو اسے چور سمجھو اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی عالم دین کو دنیا سے محبت کرتے دیکھو تو دین کے معاملے میں اس پر اعتبار نہ کرو۔ کیونکہ کسی چیز سے محبت کرنے والا اسی چیز میں غرق رہتا ہے۔ اور کسی شخص نے اپنے بھائی کو لکھا کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت دی ہے تو اپنے علم کی روشنی کو گناہوں کی تاریکی سے بجھا نہ دینا ورنہ جس دن اہل علم اپنے علم کی روشنی میں چلیں گے تو تو اندھیرے میں رہے گا۔

علماء کی دنیاوی شان و شوکت

حضرت یحیی بن معاذ الرازی علمائے دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے کہ اے علمائے دین تمہارے محل قیصر کے محلوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور تمہارے گھر کسریٰ کی شان و شوکت کا۔ اور تمہارے لباس عمدہ فیشن کے ہیں تمہارے جوتے جالوت کے جوتوں کی طرح ہیں اور سواریاں قارون کی سواریوں جیسی۔ اور برتن فرعون کے برتنوں کی یاد دلاتے ہیں۔ تم جاہلوں کی طرح گناہوں کا ارتکاب کرتے ہو اور تمہاری علمی بحثیں شیطانی ہیں۔ تو شریعت محمدیؐ کہاں گئی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

وراعی الشاۃ یحمی الذئب عنہا
فکیف اذا الرعاۃ لھا ذئاب

بھیڑوں کا چرواہا انہیں بھیڑیئے سے بچاتا ہے اور جب چرواہے ہی بھیڑیئے بن جائیں تو پھر بھیڑوں کا کیا بنے گا۔

عہدہ و امارت کا لالچ

کسی نے ایک عارف سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ایسا شخص جو گناہوں میں لذت محسوس کرتا ہے کیا اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تو اس امر میں بھی شک نہیں کہ جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا حالانکہ

اس شخص کی غفلت پہلے شخص کی نسبت کم ہے۔ یہ خیال نہ کرنا کہ صرف مال کے ترک کر دینے سے کوئی علمائے حق کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ عہدے اور اقتدار کا لالچ مال سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اسی لئے تو جناب بشرؒ نے فرمایا تھا کہ علماء کا لفظ "حدثنا" (جو حدیث روایت کے لئے بولا جاتا ہے) کہنا بھی دنیاوی جاہ کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ اور جب ہی کسی عالم کے منہ سے یہ الفاظ سنو تو اس کا مطلب یہ سمجھو کہ وہ چاہتا ہے کہ اسے اچھا مرتبہ دو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتابوں کے دس پندرہ بستے زمین میں دفن کر دیئے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ ابھی تک مجھ پر حدیث بیان کرنے کی خواہش غالب ہے۔ اور کاش مجھ سے یہ خواہش دور ہو جائے تو میں حدیث بیان کروں۔ چنانچہ آپ نے اور دوسرے حضرات نے نصیحت فرمائی کہ جب تم پر حدیث بیان کرنے کی خواہش غالب ہو تو اس وقت اسے بیان کرنے سے رک جاؤ اور جب یہ خواہش نہ رہے تو تب بیان کرو۔ اور یہ اس لئے کہ تعلیم و ارشاد کا عہدہ ملنے سے جو دنیاوی مرتبہ حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جس نے اپنی خواہشات کے کہنے پر عمل کیا تو اس کا شمار دنیادار علماء میں ہوگا۔ اسی لئے حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ حدیث کا فتنہ دنیاوی مال و دولت اور اولاد کے فتنے سے بڑھ کر ہے تو اس فتنے سے کیونکر نہ بچا جائے جبکہ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد خداوندی ہوا۔ ولو لا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً (۱۷/۷۴) اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جائے۔

اخلاص کے بغیر عمل بے سود ہے

اور جناب سہل تستریؒ نے فرمایا کہ علم تمام کا تمام دنیا ہے، اور اس میں سے حق صرف وہ ہے جس پر عمل کیا جائے اور جب تک عمل میں اخلاص نہ ہو وہ بے سود ہے۔ اور آپ نے فرمایا کہ علماء کے سوا باقی تمام لوگ مردے ہیں اور جو علماء عمل سے عاری ہیں وہ مست ہیں۔ اور اخلاص کے بغیر عمل دھوکا ہے اور صاحب اخلاص علماء کو ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا اور ابو سفیان الدارانیؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص علم حدیث طلب کرتا ہے یا شادی کرتا ہے، یا طلب معاش کے لئے سفر اختیار کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اس علم حدیث سے مراد اونچی اسناد طلب کرنا یا ایسی حدیثوں کی تلاش ہے جن کی آخرت میں ضرورت نہ ہو۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس عالم کا سفر دار آخرت حق کی طرف کس طرح ہوگا جو اپنے اس سفر میں دنیاوی راستوں کی طرف متوجہ ہو جائے بلکہ اس کا اہل علم میں شمار کس طرح ہوگا؟ اور وہ شخص بھی کس طرح عالم شمار ہوگا جو علم عمل کے لئے حاصل نہ کرے بلکہ اس کا مقصد دوسرے کا امتحان لینا ہو۔

جناب صالح بن کیسان البصری نے فرمایا کہ میں نے بہت سے اکابر اساتذہ کو بدکار عالم حدیث سے

آیات اللہ کی فروخت

اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہوئے دیکھا۔ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے والے علوم دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لئے سیکھے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو تک سے محروم رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے علمائے باطل کا وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ علم دین کے صلے میں دنیاوی فوائد حاصل کرتے ہیں اور علمائے حق کا وصف خشوع و زہد بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ علمائے باطل (علمائے دنیا) کے بارے میں ارشاد ہے۔ و اذا اخذ اللہ میثاق الذین ..... الخ۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے جنہیں کتاب عطا کی گئی تھی عہد لیا کہ تم اسے لوگوں کو صاف صاف بیان کرو گے اور اس میں سے کچھ چھپاؤ گے نہیں تو انہوں نے اسے پیٹھ پیچھے ڈالا اور اس کے عوض حقیر قیمت وصول کی۔" اس کے مقابلے میں علمائے حق کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔ وان من اھل الکتاب لمن یومن باللہ۔ ..... الخ۔ اور اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور جو کچھ تمہاری طرف یا ان کی طرف نازل کیا گیا ہے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس کی آیات کے عوض حقیر قیمت وصول نہیں کرتے۔

علماء اور قاضیوں کا مرتبہ

سلف صالحین میں سے کسی نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کو انبیاء کے گروہ کے ساتھ اور قاضیوں کو بادشاہوں کے گروہ کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جس فقیہ نے بھی اپنے علم سے دنیا طلب کی، اس کا شمار انہی قاضیوں میں ہوگا۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء میں سے کسی نبی پر یہ وحی بھیجی تھی کہ تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ جو دین کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے فقہ کا علم حاصل کرتے ہیں اور علم عمل کی نیت سے حاصل نہیں کرتے اور آخرت کے عمل یعنی علم دین سے دنیاوی مفاد حاصل کرتے ہیں۔ اور جو لوگوں کے دکھانے کے لئے بکریوں کی کھالیں پہنتے ہیں، لیکن ان کے دل بھیڑیوں جیسے ہیں، ان کی زبان شہد سے میٹھی لیکن ان کے دل ایلوے سے بھی زیادہ کڑوے ہیں، خبردار! تم لوگ مجھے دھوکا دیتے ہو اور میرے ساتھ ٹھٹھہ مذاق کرتے ہو۔ میں ان کو ایسے فتنے میں مبتلا کروں گا کہ صاحب حلم بھی حیران رہ جائیں گے۔

دنیادار عالم کو آگ کی لگام

ضحاکؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کے عالم دو شخص ہیں۔ ایک وہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے علم دیا اور اس نے بغیر کسی لالچ کے لوگوں کے لئے عام کر دیا تو ایسے عالم پر آسمان کے پرندے سمندر کی مچھلیاں اور زمین کے موذی اور فرشتے رحمت بھیجتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور وہ سید و شریف ہو کر

آئے گا یہاں تک کہ وہ رسولوں کے ہمراہ ہوگا۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا کیا لیکن اس نے کسی لالچ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اس سے بخل سے کام لیا اور اس کے بدلے قیمت وصول کی تو یہ شخص قیامت کے دن آگ کی لگام پہنا یا جائے گا اور ایک پکارنے والا تمام لوگوں کے سامنے پکار کر کہے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں علم کی نعمت سے نوازا لیکن اس نے لالچ کی وجہ سے اللہ کے بندوں کو وہ علم سکھانے میں بخل سے کام لیا۔ اور اس کے عوض قیمت وصول کی۔ اس کو عذاب ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تمام لوگوں کے حساب سے فراغت ہو جائے۔

دنیا دار عالم اور خنزیر

اور اس سے بھی سخت یہ روایت ہے کہ ایک شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت کیا کرتا تھا۔ تو (باہر) لوگوں سے کہا کرتا کہ مجھ سے موسیٰ صفی اللہ نے یوں بیان کیا (حدثنا) اور موسیٰ نجی اللہ اور کلیم اللہ نے یوں بیان کیا (یعنی علم سے دنیاوی فائدہ حاصل کرتا تھا) یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اس کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی۔ پس وہ شخص یکایک گم ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بابت دریافت کرنا شروع کیا۔ مگر کہیں سے اس کا سراغ نہ ملا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک شخص آپ کی خدمت میں ایک خنزیر کے گلے میں سیاہ رسی ڈالے ہوئے لایا۔ تو آپ نے اس شخص سے بھی اپنے خادم کے متعلق پوچھا تو اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ خنزیر (سور) وہی شخص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ الٰہی تو اس کو اصلی حالت پر لوٹا دے تاکہ میں اس کی مصیبت کا سبب پوچھوں تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں اسے کسی صورت اس کی اصل صورت میں نہ لوٹاؤں گا۔ کیونکہ وہ دین کے بدلے دنیاوی مفاد حاصل کیا کرتا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ سخت حضرت معاذ کی وہ روایت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی مصیبت یہ ہے کہ اسے کلام کرنا سننے سے زیادہ محبوب ہے۔ حالانکہ کلام یعنی تقریر میں زینت و زیادتی ہو جاتی ہے اور تقریر کرنے والا غلطی سے مامون نہیں رہتا۔ اور خاموشی میں سلامتی اور علم ہے۔

غلط فتوے دینے والے کا انجام

علماء میں سے ایک شخص وہ ہے جو اپنے علم کو اس طرح جمع رکھتا ہے کہ اتنا علم کسی دوسرے کے پاس نہ ہو، اور وہ سب سے بڑا عالم شمار ہو تو وہ دوزخ کے طبقہ اول میں ہوگا۔ اور دوسرا عالم وہ ہے جو اپنے آپ کو علم کا بادشاہ تصور کرتا ہے کہ اگر اس پر کوئی اعتراض کیا جائے، یا اس کے کسی معاملے میں سستی کی جائے، تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جائے تو یہ دوزخ کے طبقہ ثانی میں ہوگا۔ اور وہ عالم جو اپنا علم صاحب اقتدار اور دولتمند لوگوں کے لئے مخصوص کر دیتا ہے۔ اور واقعی ضرورت والوں کو اس سے محروم رکھتا ہے تو یہ دوزخ کے تیسرے درجے میں ہو گیا۔ ایک وہ شخص

ہے جو اپنے آپ کو فتوے دینے کے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ اور غلط فتوے دیتا ہے۔ (اللہ تعالیٰ ایسے مکلفوں سے بغض رکھتا ہے) تو ایسا مفتی دوزخ کے چوتھے طبقے میں ہوگا۔ اور ایک وہ عالم ہے جو اپنے علم کو زیادہ پُر رطب بنانے کے لئے یہود و نصاریٰ کی طرح تقریریں کرتا ہے تو یہ پانچویں طبقے میں ہوگا۔ ایک وہ عالم ہے جو اپنے علم کو لوگوں میں بلندی دیتا اور یادگار بناتا ہے تو وہ چھٹے طبقے میں ہوگا۔ اور ساتویں طبقے میں وہ عالم دین ہوگا جو فخر و بڑائی اختیار کرتا ہے، اپنے وعظ میں درشت لہجہ اختیار کرتا ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا اس کو نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ پس اے بھائی! علم میں خاموشی اختیار کرنا کہ شیطان پر غالب ہو اور بغیر کسی عجیب بات کے خواہ مخواہ نہ ہنسو۔ اور نہ ہی بغیر ضرورت کے فضول حرکات کرتے پھرو۔

بین الاقوامی شہرت کا عالم دین

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک آدمی کی اس قدر تعریف کھپائی ہے کہ اس تعریف سے مشرق و مغرب بھر جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہوتا۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ جب حضرت حسن بصریؒ ارشاد و وعظ کے بعد اپنی مجلس کی طرف لوٹنے لگے تو ایک خراسانی شخص نے ایک تھیلی میں پانچ ہزار درہم اور نفیس کپڑے کے دس تھان آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ اور کہا کہ درہم تو آپ کے خرچ کے لئے ہیں اور کپڑے آپ کے لباس بنانے کے لئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ تم کو عافیت سے رکھے، اپنی یہ دونوں چیزیں اٹھا لو ہم کو اسکی حاجت نہیں، جو شخص میری جیسی مجلس میں بیٹھے اور پھر لوگوں سے اس قسم کی نذریں قبول کرلے تو جب وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوگا تو اس کا دین میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اور حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ ہر عالم دین کے پاس نہ بیٹھو بلکہ صرف اسی عالم دین کی مجلس میں جاؤ، جو پانچ امور سے دوسری پانچ چیزوں کی طرف بلائے۔ اول شک سے یقین کی طرف۔ دوم دینی دکھلاوے سے اخلاص کی طرف، سوم دنیاوی خواہشات سے زہد کی طرف، چہارم تکبیر سے عاجزی کی طرف، اور پنجم دشمنی سے خیر خواہی کی طرف۔ قارون کی بابت ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فخرج علیٰ قومہ فی زینتہ ..... الخ اور پھر وہ اپنی قوم میں خوب زیب و زینت سے نکلا۔ اور جو طالب دنیا تھے انہوں نے کہا کاش ہمیں بھی کسی طرح قارون کی طرح دولت ملے۔ بے شک وہ بڑی قسمت والا ہے اور جنہیں علم عطا ہوا تھا انہوں نے کہا ہائے تم پر افسوس اللہ تعالیٰ کا ثواب اس شخص کے لئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کرے۔ اور یہ بات صرف صابروں کے دل ہی میں پڑتی ہے۔" اس آیت میں اہل علم کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے کر اسے اختیار کرتے ہیں۔

اور علمائے حق کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان کے قول و فعل میں تطابق ہو۔ بلکہ جب تک کسی چیز پر خود عمل نہ

عالمِ دین کے قول و فعل میں تطابق

کریں، دوسروں کو اس کی نصیحت نہ کریں۔ ارشادِ ربانی ہے کہ لوگوں کو تو تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ اور ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ باتیں کہو جن پر تم خود عمل نہیں کرتے (کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون)۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں ارشادِ ربانی ہے کہ جن کاموں سے تمہیں روکتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی اور طرف چلاؤں اور خود کسی اور طرف کو چلوں۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرتے رہو جو تمہیں علم سکھاتا ہے۔ اور پھر ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور علم حاصل کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ اے مریم کے بیٹے! تو اپنے نفس کو نصیحت کر۔ اگر وہ نصیحت حاصل کرلے تب دوسرے لوگوں کو نصیحت کر ورنہ مجھ سے حیا کر۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ معراج کی رات میرا گذر ایسے لوگوں پر ہوا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا تم کون ہو؟ تو کہنے لگے کہ ہم دوسروں کو خیر کی طرف دعوت دیتے تھے اور خود نہ کرتے تھے اور دوسروں کو بدی سے منع کرتے تھے لیکن خود اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کی بربادی بدکار عالم دین اور جاہل عبادت گذار سے ہے اور سب بُروں سے بُرے علمائے باطل ہیں۔ اور سب اچھوں سے اچھے علمائے حق ہیں۔ امام اوزاعی کا کہنا ہے کہ رضاری کے مقبروں نے اللہ تعالیٰ سے شکایت کی کہ کفار کے مردوں کی بُو ہمیں ستاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے مطلع فرمایا کہ علمائے باطل کی باطنی بدبو اُن مردوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا سنا ہے کہ قیامت کے دن علمائے باطل کا حساب کتاب بُت پرستوں سے بھی پہلے ہوگا۔ اور حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا ہے کہ جو شخص نہیں جانتا تو اسے تو ایک دفعہ ہلاکت ہے لیکن جو جانتا ہے اور عمل نہیں کرتا تو اس کے لئے سات بار ہلاکت ہے۔ امام شعبیؒ نے فرمایا کہ جنت کے کچھ لوگ دوزخ کے بعض لوگوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ تم دوزخ میں کس بنا پر بھیجے گئے ہو حالانکہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم و تادیب سے جنت میں داخل کیا۔ تو وہ جواب دیں گے کہ ہم دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتے تھے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ اور دوسروں کو برائی سے روکتے تھے اور خود اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور حاتم اصمؒ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اس عالمِ دین سے زیادہ حسرت کسی اور کو نہ ہوگی کہ جس نے لوگوں کو دین سکھایا تو انہوں نے اس پر عمل کیا لیکن خود اس عالم نے عمل نہ کیا۔ پس وہ تو اس کے سبب سے کامران ہوئے اور وہ خود ہلاکت کے گڑھے میں گر گیا۔ اور مالک بن دینارؒ نے فرمایا کہ جب کوئی عالمِ دین اپنے علم کے بموجب عمل نہیں کرتا تو اس کی نصیحت دلوں سے ایسی پھسل جاتی ہے جیسے صاف پتھر سے پانی کا قطرہ ڈھل جاتا ہے۔

مکی پتھر کا واقعہ

ابراہیم بن ادہم فرماتے ہیں کہ میں مکہ شریف میں ایک پتھر کے پاس سے گزرا جس پر لکھا تھا۔ کہ مجھے الٹ کر عبرت حاصل کرو۔ میں نے اسے الٹا تو اس پر یہ عبارت لکھی تھی کہ تو جو کچھ جانتا ہے اس پر تو عمل کرتا نہیں اور ایسی چیز کا علم کیسے طلب کرتا ہے جو تجھ کو معلوم نہیں۔ اور ابن سماک نے فرمایا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ دوسروں کو اللہ تعالےٰ کی یاد دلاتے ہیں اور خود اسے بھولے ہوئے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں جو اللہ تعالےٰ سے ڈراتے ہیں اور خود اس پر دلیر ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو دوسروں کو اللہ تعالےٰ سے نزدیک کرنے والے ہیں لیکن خود اس ذات باری سے دور ہیں۔ اور بہت سے لوگ دوسروں کو اس ذات حق کی طرف بلاتے ہیں اور خود اس سے دور بھاگتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا مگر اس کی آیات سے علیحدہ ہیں۔ اور ابراہیم بن ادہم فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے کلام میں فصاحت کا خیال کیا تو اسے غلطی سے پاک کیا۔ مگر اعمال میں غلطی کی تو اسے پاک نہ کیا۔ اور امام اوزاعی نے کہا کہ جب تقریر کی خوبصورتی کا خیال کیا تو خشوع جاتا رہا۔ اور جناب مکحول نے حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ سے روایت کی کہ انہیں بیس اصحابہؓ رسول نے یہ حدیث بیان کی کہ ہم مسجد قبا میں علم کے درس میں مشغول تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ جس قدر چاہو علم حاصل کر لو۔ جب تک اس پر عمل نہ کرو گے، اللہ تعالےٰ تمہیں اس کا ہرگز کوئی ثواب نہ دینگے۔ اور عیسےٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص علم حاصل کرتا ہے اور پھر اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسی کوئی عورت خفیہ زنا کرے جس سے اسے حمل ٹھہر جائے اور جب وہ حمل ظاہر ہو تو اس کی رسوائی ہو۔ اسی طرح وہ شخص جو علم حاصل کرنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتا تو اللہ تعالےٰ تمام مخلوق کے سامنے اسے رسوا کرینگے۔

عالم دین کی لغزش

حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ عالم دین کی لغزش سے ڈرو کیونکہ لوگوں میں اس کی بڑی عزت ہوتی ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی لغزش میں بھی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب کوئی عالم دین لغزش کرتا ہے تو اس سے مخلوق کے ایک بڑے عالم کی لغزش ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی آپ ہی کا ارشاد ہے کہ دنیا کے لوگ تین باتوں سے برباد ہوتے ہیں۔ ان میں ایک عالم کی لغزش ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ دل کی شیرینی کھاری ہو جائیگی اور اس وقت علم نہ عالم دین کو اور نہ طالب علم کو کچھ فائدہ دے گا اور ان کے علماء کے دل کھور والی زمین کی مانند ہو جائینگے کہ اس پر بارش کے قطرے گرتے ہیں اور ان میں ذرا شیرینی معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب علماء کے دل دنیا کی محبت کی طرف مائل ہو جائینگے اور اسے آخرت پر ترجیح دیں گے۔ اس وقت اللہ تعالےٰ ان کے دلوں سے حکمت کے سرچشمے نکال کر ہدایت کی شمعوں کو گل کر دے گا۔ پس جب تم

ایسے علماء سے ملو گے تو زبان سے کہیں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں مگر ان کے کاموں سے بدکاری کی بُو آئے گی پس اس زمانے میں زبانوں کی کیسی ارزانی ہو گی اور دل کیسے گراں ہوں گے! اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں یہ صورت حالات اس وجہ سے ہو گی کہ علماء نے دین غیر اللہ کے لئے سکھایا اور شاگردوں نے غیر اللہ کے لئے سیکھا۔ اور توریت اور انجیل میں مرقوم ہے کہ جس چیز کو تم نہیں جانتے، اس کا اس وقت تک علم حاصل نہ کرو جب تک جس قدر تم نے علم حاصل کر لیا ہے اس پر عمل نہ کر لو۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر کوئی اپنے علم کے دسویں حصے کو بھی چھوڑ دے تو ہلاکت میں پڑ جائے۔ اور عنقریب ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس میں اگر کوئی شخص اپنے علم کے دسویں حصے پر بھی عمل کرے گا تو نجات پا جائے گا۔ اور یہ صورتِ حالات جھوٹے علماء کی کثرت کے باعث ہو گی۔

علماء اور قاضی

اور معلوم ہونا چاہیئے کہ عالمِ دین کی مثال قاضی کی طرح ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قاضی تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس نے حق کا فیصلہ حق جانتے ہوئے دیا۔ تو اس کا مقام جنت میں ہو گا دوسرا قاضی وہ ہے جس نے ظلم کا فیصلہ سنایا، چاہے وہ اس ظلم کو جانتا ہے یا نہیں۔ تو اس کا ٹھکانہ دوزخ میں ہو گا۔ اور وہ قاضی جس نے احکامِ الٰہی کے خلاف فیصلہ دیا تو اس کا ٹھکانہ بھی آگ ہی میں ہے۔ اور کعبؓ نے فرمایا کہ آخری زمانے میں ایسے علماء دین ہونگے کہ جو لوگوں کو زہد اختیار کرنے کی دعوت دیں گے اور خود زاہد نہ بنیں گے۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلائیں گے لیکن وہ خود خوف نہیں کھائیں گے۔ دوسروں کو دنیاوی حاکموں کے پاس جانے سے منع کریں گے لیکن خود ان کی خدمت میں حاضر ہونگے۔ اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں گے اور اپنی چرب زبانی سے دنیاوی عیش و عشرت حاصل کریں گے۔ وہ اپنی مجالس میں غریبوں کی نسبت امیروں کو جگہ دیں گے۔ اور یہ لوگ علم پر ایسے لڑیں گے جس طرح عورتیں مردوں پر لڑتی ہیں۔ جب ان کا کوئی شاگرد دوسرے عالم کے پاس جا بیٹھے گا تو وہ اس پر غصے ہونگے۔ یہ لوگ متکبر اور اللہ تعالیٰ کے دشمن ہونگے۔

شیطانی علم

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان تم پر کبھی علم کے ذریعے غالب ہونے کی کوشش کرے گا۔ تو صحابہؓ نے عرض کیا وہ کیسے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یوں کہے گا کہ علم حاصل کرو اور جب تک علم حاصل نہ کرے اس پر عمل نہ کرے پس وہ شخص حصولِ علم میں مصروف رہے گا لیکن عمل میں لیت و لعل کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ موت اس کو آلے گی اور اس نے کوئی عمل نہ کیا ہو گا اور سری السقطیؒ نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص جو طلبِ علم ظاہر کا حریص تھا اس نے عبادت گزاری کے لئے گوشہ نشینی اختیار کی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے اپنا خواب بیان کیا کہ مجھے کوئی کہہ رہا تھا کہ خدا تجھے کھو دے

تو کب تک علم کو ضائع کرتا رہے گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو اسے یاد کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ علم کا یاد کرنا تو اس پر عمل کرنا ہے۔ اس لئے میں نے علم کا حصول ترک کر کے عمل کیطرف توجہ کی۔ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ علم کثرت روایت سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ علم تو خوفِ خدا کا نام ہے۔ اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جتنا چاہو علم حاصل کر لو جب تک اس پر عمل نہ کرو گے اللہ تعالےٰ اس پر ہرگز ثواب نہ دینگے۔ اسلئے کہ بیوقوفوں کا مقصدِ علم، روایت کرنا ہے اور علماء کی غرض رعایت کرنا ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علم کا حصول اور پھیلانا دونوں اچھے کام ہیں بشرطیکہ نیت درست ہو۔ مگر دیکھو کہ جو چیز صبح سے شام تک تمہارے ساتھ رہے اس پر دوسری چیز کو اختیار نہ کرنا۔

قرآن مجید عمل کیلئے اتارا گیا ہے

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن حکیم اس لئے نازل ہوا ہے کہ تم اس پر عمل کرو۔ لیکن تم نے اس کے پڑھنے پڑھانے ہی کو عمل سمجھ لیا ہے اور عنقریب کچھ لوگ ایسے ہونگے جو اسے تیروں کی طرح سیدھا کریں گے۔ وہ تم سے اچھے نہ ہوں گے۔ وہ عالمِ دین جو بے عمل ہے اس کی مثال اس مریض جیسی ہے جو اپنی دوا کی صفات بیان کرے لیکن استعمال نہ کرے یا اس بھوکے آدمی کی طرح جو لذیذ لذیذ کھانوں کے نام مزے لے لے کر بیان کرے لیکن ان کو حاصل نہ کر سکتا ہو۔ ایسے شخص کے بارے ہی میں تو ارشادِ ربانی ہے کہ تمہارے لئے خرابی ہے ان باتوں سے جنہیں تم بیان کرتے ہو۔ (و لکم الویل مما تصفون)۔ اور حدیث شریف میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جن چیزوں سے میں اپنی امت پر ڈرتا ہوں۔ ان میں ایک عالمِ دین کی لغزش ہے اور دوسری قرآن مجید کے بارے میں منافق کا جھگڑا کرنا ہے۔

اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کی توجہ ایسے علم کی طرف ہو جو آخرت میں کام آئے اور اطاعتِ الٰہی کی رغبت دلائے اور ان علوم سے اجتناب کریں جو کم مفید ہوں اور ان میں بحث مباحثہ اور قیل و قال زیادہ ہو۔ پس جو شخص عملی علوم سے اعراض کر کے علم مناظرہ کے حصول میں منہمک ہو جائے اس کی مثال اس بیمار جیسی ہے جس کو بہت سی بیماریاں ہوں اور وہ کسی تجربہ کار حکیم سے ملے اور وقت تنگ ہو کہ شاید وہ حکیم چلا جائے اور ایسے وقت میں وہ طبیب مذکور سے دواؤں کی خاصیت اور علم طب کے عجوبے پوچھنے لگے اور جس مصیبت میں گرفتار ہے اس کو دریافت نہ کرے تو اس شخص کی حماقت میں کیا شک ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ کوئی شخص حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور علم کی عجیب و غریب باتوں کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے اصل علم میں کیا کیا ہے؟ اس نے عرض کی کہ اصل علم کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ تو نے اللہ تعالےٰ کو پہچانا یا اس نے اثبات میں جواب

دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر تو نے اس کے حق میں کیا عمل کیا تو اس نے عرض کیا کچھ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تو نے موت کو پہچانا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تو نے پھر اس کے لئے کیا تیاری کی۔ اس نے جواب دیا کہ کچھ بھی نہیں۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اب جا اور پہلے ان امور میں سچتہ ہو۔ تب تجھ کو علم کی عجیب وغریب باتیں بتائیں گے۔

———— (۰۰۰) ————

مفہوم القرآن کا جدید ایڈیشن

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں قارئین سے گزارش کیا گیا تھا کہ وہ مفہوم القرآن کے مجوزہ جدید ایڈیشن کے سلسلہ میں ہمیں اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیں۔ یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ قارئین نے اس باب میں بڑی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے اور ان کی طرف سے آنے والے مشوروں کا گویا تانتا بندھ گیا ہے۔ ان سب میں ایک بات بطور قدر مشترک کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ مفہوم القرآن کو عربی متن کے بغیر نہ شائع کیا جائے۔ یہ رائے عین ہمارے منشا کے مطابق ہے۔ قارئین کو علم ہوگا کہ ہم نے بلا متن قرآن کریم کے تراجم کی اشاعت کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ لہٰذا اس معاملہ کو طے شدہ سمجھئے کہ مفہوم القرآن بلا متن شائع نہیں کیا جائے گا۔

احباب کے دیگر مشورے زیر غور ہیں اور چونکہ ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے اسلئے ان کے متعلق ہم سر دست کسی حتمی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اپنے قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

باب المراسلات

ختم نبوت

(پیشگوئیاں)

سوال:- آپ نے میرے سابقہ استفسار کے جواب میں طلوع اسلام بابت ماہ مئی میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ختم نبوت کا مسئلہ اس طرح واضح اور صاف ہو گیا ہے کہ اس باب میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں حیران ہوں کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق ہم اس قدر حساس واقع ہوتے ہیں (اور ہمیں ایسا احساس ہونا بھی چاہئے کیونکہ اسلام کی اصل و بنیاد ہی ختم نبوت ہے) لیکن جس راستے سے یہ دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اس طرف ہماری نگاہ ہی نہیں جاتی۔ لاریب یہ کشف و الہام کا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے۔ فجزاك الله احسن الجزاء۔ اسی سلسلہ میں پیشین گوئیوں کا سوال سامنے آتا ہے۔ میں شکرگزار ہوں گا۔ اگر آپ اس کی بھی وضاحت فرما دیں کہ پیشین گوئیاں کرنے والوں کی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

جواب:- کسی لمبی چوڑی بحث میں الجھے بغیر مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ

(۱) پیشین گوئی کرنے والے کا دعوے یہ ہوتا ہے کہ وہ غیب کا علم جانتا ہے۔

(۲) غیب کے علم سے مراد ہے وہ علم جو سمع و بصر و فواد (حواس) کے ذریعے حاصل نہ ہو سکے۔

اب آگے بڑھیے۔ قرآن کریم میں ہے کہ غیب کا علم خدا کے لئے مخصوص ہے۔ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (۱۰/۲۰) ان سے کہہ دو کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ۔ (۲۷/۶۵)۔ ان سے کہہ دو کہ ارض و سما (کائنات) میں خدا کے سوا کوئی نہیں جسے غیب کا علم حاصل ہو۔

(۳) خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جس حد تک چاہتا ہے غیب کا علم عطا کر دیتا ہے۔ (۲۶/۷۲)

كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۳/۱۷۹) اور خدا ایسا کرتا ہی نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے۔ ہاں البتہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اس مقصد کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ .... (۷۲/۲۶) - خدا عالم الغیب ہے، وہ اپنے غیب کا علم کسی شخص پر ظاہر نہیں کرتا بجز اس رسول کے جسے وہ اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ

(۱) عالم الغیب خدا ہے۔

(۲) وہ صرف رسولوں کو غیب کا علم عطا کرتا تھا کسی اور کو نہیں۔

(۳) رسولوں کو غیب کا علم وحی کے ذریعے ملتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ مثلاً حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ۔ (۳/۴۴) یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم اے رسول! تیری طرف وحی کرتے ہیں۔ داستان حضرت نوحؑ بیان کرنے کے بعد کہا۔ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۔ (۱۱/۴۹) اے رسول! یہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ اس سے پہلے انہیں نہ تو جانتا تھا نہ تیری قوم۔ یہی الفاظ تذکرۂ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دہرائے گئے ہیں۔ یعنی ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ .... (۱۲/۱۰۲)

(۴) ان آیات سے واضح ہے کہ رسولوں کو غیب کا علم بذریعہ وحی عطا ہوتا تھا۔ انہیں جن امور غیب کا علم بذریعہ وحی نہیں ملتا تھا، ان کا علم وہ از خود حاصل نہیں کر سکتے تھے اور واضح الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے تھے۔ خود نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا گیا کہ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ .... اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ (۶/۵۰) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میں قطعاً اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ ہی اس کا دعویٰ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ... (۷/۱۸۸) (ان سے کہہ دو کہ) اگر میں غیب کا علم رکھتا تو میں اپنے لئے ڈھیروں دولت جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو تک نہ سکتی۔

(۵) یہ بات کہ کوئی شخص مستقبل کا علم نہیں رکھ سکتا، ان واضح الفاظ میں کہہ دی کہ وَمَا تَدْرِيْ

نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا ۔ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۔ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۔ (۳۱/۳۴) کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کی موت کس خطۂ زمین میں واقع ہوگی علیم و خبیر صرف خدا ہے۔ اور کوئی نہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے ان تصریحات کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مستقبل کے حالات قبل از وقت بتا سکتا ہے (اسی کو پیشین گوئی کہتے ہیں) تو اس کا یہ دعویٰ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یعنی۔

(۱) یا تو وہ اس کا مدعی ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے اور اسے یہ علم وحی کے ذریعے ملا ہے۔

(۲) اگر وہ ایسا دعویٰ نہیں کرتا تو وہ یہ کہتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ غیب کا علم خدا اور اسکے رسولوں کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری طرف دیکھو۔ میں رسول ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود میں غیب کی باتیں بتا سکتا ہوں۔

اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے کہ ختم نبوت کے بعد پیش گوئیاں کرنے والوں (اور ان کی پیشین گوئیوں پر کان دھرنے والوں) کا قرآن کریم کی رو سے مقام کیا ہے۔ یہ دعوائے رسالت نہیں تو اور کیا ہے؟

(۰)

یہاں تک ہم نے ان لوگوں کے متعلق بات کی ہے جو اس کا دعوے کرتے ہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم پاکر پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایسا دعوے کئے بغیر پیشین گوئیاں کرتے ہیں (جیسا کہ عام طور پر اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے) سو ان کے متعلق اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی قیاس آرائیاں ہوتی ہیں جن میں سے بعض ٹھیک نکل آتی ہیں اور بعض غلط ثابت ہوتی ہیں۔ قرآن اسے رجماً للغیب سے تعبیر کرتا ہے (۱۸/۲۲) یونہی اٹکلیں دوڑانا اور اندھیرے میں تیر چلانا۔

(۰)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس قسم کی باتوں کو چھوڑ کر حدیث مجدد کی روشنی میں میرزا صاحب کے دعوائے مجددیت کو پرکھنا چاہیئے۔ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ میرے نزدیک تو یہ حدیث ہی وضعی ہے کیونکہ یہ ختم نبوت کی نقیض اور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے جو اسے صحیح مانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ اس حدیث کی رو سے ایک مجدد کا زمانہ مجددیت سو سال کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا مجدد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے مرزا صاحب کی مجددیت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یوں کہئے کہ عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ لہٰذا اب ان کے دعویٰ کے پرکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اب جو نیا مجدد آئے گا اس کے متعلق بات کر لی جائیگی۔

اب تو مرزا صاحب کے مجدد ماننے والوں کے لئے بھی ضروری ہوگا کہ وہ (حدیثِ مجدد کی روشنی میں) اس آنے والے مجدد کی تلاش شروع کر دیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اس بارگاہ رسالتمآبؐ کے وابستۂ داماں ہونے کا فخر اور سعادت حاصل ہے جس کی نبوت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اسلئے مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ان کی تلاش شروع کروں جو آج ہیں اور کل کو نہیں ہونگے۔ میں ایمانِ ابراہیمی کے اتباع میں یہ کیوں نہ کہوں کہ لَا أُحِبُّ الْآفِلِيْنَ۔ (۶/۷۶) میں غروب ہو جانے والوں سے دل نہیں لگا سکتا۔ ابدی سورج کی موجودگی میں موم بتیوں کی تلاش میں کیوں نکلا جائے۔ (پرویز)

— (۰) —

۲۔ مودودی صاحب اور صحابہ کبارؓ

کراچی سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی مایہ ناز تصانیف میں سے کچھ ان دنوں میرے زیرِ مطالعہ ہیں۔ تفہیمات جلد دوم صفحہ ۵۷ (اشاعت سوم) کے حاشیہ پر موصوف نے تحریر فرمایا ہے۔

”اسرائیلیوں کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی کہ کوئی شخص کسی کی بیوی کو پسند کر کے اس سے طلاق کی درخواست کرے۔ نہ درخواست کرنے والا اس میں تکلف محسوس کرتا تھا اور نہ ہی وہ شخص جس سے درخواست کی جاتی؛ اس پر بُرا مانتا تھا۔ اور یہ تو ایک عمدہ اخلاق کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص کسی دوست کو خوش کرنے یا اس کی تکلیف رفع کرنے کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اسکے نکاح میں دے۔ چنانچہ یہ یہودی اخلاق ہی کا اثر تھا کہ مدینہ میں بعض انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی خاطر اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔“

پہلی چیز تو یہ کہ یہودیوں کے جس ”عمدہ اخلاق“ کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے وہ دوستوں کی بیویوں کو پسند کرنا ہے۔ دوسری بات جو اس سے واضح ہوتی ہے وہ دوست کو خوش کرنے کا تقاضا ہے۔ تیسرے یہ کہ مدینہ کے مومنین مہاجر اور انصار کے مندرجہ دونوں ”عمدہ اخلاق“ کو مسلمانوں کو اپنانے میں کوئی کراہت ہی محسوس نہیں کی گئی ہے بلکہ جیسا کہ موصوف جھوٹ بولنے کے سلسلہ میں فرما چکے ہیں کہ عملی زندگی کی بعض ضروریات کے تحت نہ صرف جھوٹ کی اجازت ہے بلکہ اسکے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس ”عمدہ اخلاق“ کے وجوب کا فتویٰ اس میں نظر آتا

ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مدینہ کے مہاجرین نے کسی "عمدہ اخلاق" کے مظاہرہ کے لئے انصار کی بیویوں کو پسند کر کے ان سے شادیاں کی تھیں اور کیا مدینہ کے انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں اور دوستوں کو خوش کرنے کے لئے اس کا مظاہرہ کیا تھا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، نہ تو مہاجرین پر یہودیوں کے اس انسانیت سوز اخلاق کا کوئی اثر تھا۔ اور نہ ہی مدینہ کے انصار اس سے متاثر تھے۔ قرآن کریم نے تو مہاجرین و انصار کے سلوک کو سراہا ہے۔ اگر یہ سلوک یہودی تہذیب کے اثر سے تھا تو نہ صرف یہ کہ قرآن اس کو نہ سراہتا بلکہ اس سے سختی سے روک دیتا۔ براہِ مہربانی انصار و مہاجرین کی ان شادیوں کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے۔ اس کی وضاحت طلوعِ اسلام میں فرما دیں۔

مودودی صاحب نے حاشیہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ لفظاً لفظاً نقل کیا گیا ہے۔

طلوعِ اسلام: ۱۔ ہمارے پاس تفہیمات جلد دوم کا پہلا ایڈیشن ہے اس کے صفحہ ۱۹۵ پر یہ حاشیہ نہیں ہے لیکن صاحبِ مکتوب قابلِ اعتماد شخص ہیں اس لئے ہم ایسا تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے کہ اس کتاب کی اشاعت سوم میں یہ حاشیہ ہوگا۔

۲۔ مودودی صاحب کے متعلق دو باتیں واضح ہیں۔

(۱) وہ عورت کو انسان نہیں بلکہ استعمال کی اشیاء میں سے سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کے متعلق ان کا مسلک یہ ہے کہ انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور وہ بلا تعداد اور بلا نکاح ان سے جنسی روابط قائم کریں گے۔ اور اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسا برتاؤ قابلِ استعمال اشیاء ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ انسانوں سے نہیں۔ اور

(۲) صحابہ کبارؓ سے انہیں خاص بغض ہے چنانچہ وہ روایات اور تاریخ سے چن چن کر ایسے واقعات سامنے لائیں گے جن میں صحابہؓ کی شان میں کسی قسم کا طعن پایا جائے۔ ان کا مسلک عام تاریخ ہی کے متعلق نہیں بلکہ احادیث کے متعلق بھی یہ ہے کہ ان میں کی کوئی بات بلا تنقید من و عن قبول نہیں کی جا سکتی۔ قبول وہی باتیں کی جائیں گی جنہیں مودودی صاحب صحیح قرار دیں گے۔ اپنے اس نظریہ کے مطابق وہ کتبِ روایات و تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور ان میں سے وہ باتیں چن چن کر اخذ کر لیتے ہیں جن سے صحابہ کبارؓ کے خلاف ذم کا پہلو نکلتا ہو۔ اور اگر ان سے براہِ راست ایسا پہلو نہ نکلتا ہو تو ان سے بطور استنباط ایسا نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" اس کی زندہ شہادت ہے یہی کیفیت زیرِ نظر واقعہ کی بھی ہے۔

(۳) قرآن کریم میں انصار کی بیویوں کے ساتھ مہاجرین کے اس طرح نکاح کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔

(۴) جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں، بخاری میں ایک روایت ہے جس میں اس قسم کا ذکر ملتا ہے۔ وہ روایت حسب ذیل ہے۔

ابراہیم بن سعد اپنے والد سے، وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ جب مہاجرین مدینہ میں آئے تو رسولؐ خدا نے عبدالرحمٰن (بن عوف) اور سعد بن ربیع میں بھائی چارہ کرا دیا۔ سعد نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ میں تمام انصار میں باعتبار مال کے زیادہ ہوں۔ پس میں اپنے مال کے دو حصے کئے دیتا ہوں۔ ایک تم لے لو۔ اور میری دو بیویاں ہیں۔ دیکھو۔ ان میں سے تمہیں کونسی پسند ہے۔ اسے مجھے بتا دو تاکہ میں اسے طلاق دے دوں۔ پھر جب اس کی عدت گذر جائے تو تم اس سے نکاح کر لینا۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ خدا تمہیں مال اور تمہاری بیویوں میں برکت دے (مجھے اس کی ضرورت نہیں) مجھے بتا دو کہ تمہارا بازار کہاں ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو بنی قینقاع نامی بازار بتا دیا۔ پس جب وہ بازار سے لوٹے تو ان کے ہمراہ کچھ پنیر اور اور گھی تھا۔ بعد اس کے وہ برابر صبح کو جانے لگے۔ پھر ایک دن وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ان کے لباس پر کچھ زردی لگی ہوئی تھی۔ تو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا یہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نکاح کیا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تم نے مہر کیا دیا۔ انہوں نے کہا ایک گٹھلی سونے کی یا (یہ کہا کہ) ایک گٹھلی برابر سونا۔

(بخاری۔ مناقب انصار۔ شائع کردہ۔ اصح المطابع۔ کراچی
جلد دوم۔ صفحہ ۳۴۵)

یہ ہے وہ روایت جس سے مودودی صاحب نے وہ نتائج اخذ فرمائے ہیں۔ جو مکتوب میں درج ہیں۔ ہم اس روایت کے اس حصہ کو (جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت سعد نے اپنی ایک بیوی کو طلاق دینے کی تجویز بھی پیش کر دی تھی) صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے اتنا ہی مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ انصار میں سے ایک صاحب جذبۂ ایثار و مواخات میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے دو بیویوں کو بھی آپس میں تقسیم کر لینے کی تجویز پیش کر دی۔ شدت جذبات پر مبنی یہ تجویز صحیح نہیں تھی۔ مودودی صاحب اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں اور "یہودی اخلاق کا اثر" بتلاتے ہیں۔ انصار کے جذبۂ ایثار کے متعلق قرآن کی یہ شہادت ان کے نزدیک درخور اعتنا نہیں کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ (انصار) مہاجرین کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی ہی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہودیوں کے ہاں

(بیویوں کے سلسلہ میں) اگر اس قسم کا کوئی رواج تھا تو اسے ایک معیوب رسم سمجھنا چاہیئے نہ کہ عمدہ اخلاق جس سے (معاذ اللہ) صحابہؓ بھی متاثر تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ یرقان زدہ آنکھ کو کس طرح ہر شے رنگین نظر آتی ہے۔

—— (-) ——

۳۔ امّت میں اختلافات اور قرآن

کراچی سے آمدہ ایک خط ملاحظہ فرمایئے۔

"میں نے طلوعِ اسلام کے اپریل ۱۹۷۰ء نمبر میں لمعات بڑے غور سے پڑھے جس درد اور خلوص سے یہ مضمون لکھا گیا ہے وہ تحسین کے قابل ہے۔ لیکن میں یہ کہنے کی معافی چاہتا ہوں کہ اس میں بعض بیانات ایسے ہیں جو حقیقت سے دور یا مزید تشریح کے محتاج ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ آئندہ کسی اشاعت میں اس خط کے ساتھ اپنا جواب بھی چھاپ دیں تاکہ زیرِ بحث معاملات زیادہ واضح ہو جاویں۔ میں یہ درخواست نیک دلی سے کر رہا ہوں۔

پہلا سوال:۔ آپ نے اس مضمون کے ابتداء میں یہ فرمایا ہے کہ "زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے انسان کو عقل و فکر کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔ لیکن زندگی کے حقائق کا دریافت کر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی اس لئے آئینِ فطرت میں استثناء کیا گیا اور ان حقائق کا انکشاف وحی کے ذریعہ کیا گیا"۔ اس عبارت کا مطلب کم از کم میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ جب نسلِ انسانی کا زمین پر ظہور ہوا تو گو قدرت نے اس کو عقل و فکر کی صلاحیت سے نوازا تھا لیکن اس عقل و فکر کی مدد سے وہ زندگی کے حقائق دریافت نہ کر سکا۔ بلکہ بار بار گمراہ ہوتا رہا۔ اور اس کی اصلاح کے لئے اور زندگی کے حقائق کے انکشاف کے لئے بار بار وحی کی ضرورت پڑی۔ حقیقت اس مطلب کے برعکس ہے۔ کیونکہ اگر ہم انسانی نسل کے ارتقاء اور اس کی عقل و فکر کی ترقی کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات ظاہر ہو گی کہ شروع میں انسانی عقل و فکر بہت ابتدائی مدارج میں تھا۔ اور مرورِ زمانہ کے ساتھ نہ صرف انسان کی عقل میں ترقی ہوئی۔ بلکہ حواسِ خمسہ اور اپنی عقل کے استعمال سے اس کا مشاہدہ اور تجربہ بھی زیادہ وسیع اور عمیق ہوتا گیا جس سے انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی۔ اس لئے اس پہلے زمانے میں جب انسانی عقل ابتدائی مدارج میں تھی اور انسان کا تجربہ بہت محدود تھا، اس کو وحی کی ضرورت تھی۔ لیکن جیسا آپ نے خود بیان کیا ہے جب انسانی عقل ایک خاص درجہ پر پہنچ گئی اور انسانی تجربہ اتنا پختہ اور وسیع ہو گیا کہ اس کی بنا پر انسان اپنے لئے راہِ عمل تلاش کر سکتا ہے۔ تو قدرت نے فیصلہ کیا کہ اب مزید وحی کی ضرورت نہیں ۔ اور

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی۔

اس سلسلہ میں کیا میں یہ بھی دریافت کرسکتا ہوں کہ وہ کونسا آئینِ فطرت تھا جس میں بقول آپ کے شروع شروع میں استثنا کیا گیا۔

دوسرا سوال:۔ دوسری بات جو حقیقت کے خلاف یا تشریح طلب ہے وہ یہ ہے کہ پہلے امت کے پاس ایک ہی کتاب تھی (یعنی قرآنِ کریم) اس کا ایک ہی نظام تھا اور امت امتِ واحدہ تھی۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی پارٹی نہیں تھی۔ اس کے بعد جب اس امت کا شیرازہ بکھر گیا، تو امت کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ اس سلسلہ میں پہلے تو میں یہ عرض کردوں کہ اس زمانے میں جب کہ دوسری قدیم زبانوں مثلاً یونانی، لاطینی، سنسکرت وغیرہ میں ہزاروں نثر اور نظم کی کتابیں لکھی جا چکی تھیں، جہاں تک مجھے علم ہے عربی زبان میں کوئی کتاب بحیثیت کتاب کے لکھی نہیں گئی تھی (میں سبع معلقات کو کتاب کی حیثیت نہیں دیتا) اس لئے شروع شروع میں اگر مسلمانوں کے پاس صرف ایک کتاب تھی تو وہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دوسرے میں آپ سے یا دب پوچھنا چاہتا ہوں کہ

تیسرا سوال:۔ وہ سنہری زمانہ جس میں امت امتِ واحدہ تھی۔ کوئی فرقہ نہ تھا، کوئی پارٹی نہ تھی۔ کل کتنے سال رہا۔ یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور پہلے دو خلفائے راشدین اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے پہلے سالوں میں یہ کیفیت رہی۔ لیکن کیا اس کے بعد بھی یہی حالت جاری رہی۔ کیا حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے دورِ خلافت میں اور اس کے بعد فرقہ بندی اور پارٹی بازی شروع نہیں ہوگئی تھی۔ کیا خوارج، شیعانِ علی کرم اللہ وجہہٗ اور بنو امیہ میں شدید اختلافات رونما نہیں ہوگئے تھے۔ جن میں بعد میں بنو عباس بھی شامل ہوگئے۔ کیا بیک وقت تین خلافتیں بلادِ اسلامیہ میں جاری نہیں رہیں۔ اگر یہ سب اور بہت کچھ تاریخی حقائق ہیں تو ہمیں آنکھوں پر پٹی باندھنے یا مسلسل آہ و بکا کرنے کے بجائے ان کے اسباب تلاش کرنے چاہئیں۔ اور ساتھ یہ بھی دریافت کرنا چاہیئے کہ کیا اس تفرقہ کی ذمہ داری تمام تر ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے۔

چوتھا سوال:۔ اس ضمن میں کیا میں ایک اور سوال بھی آپ سے کرسکتا ہوں۔ آپ نے اپنی تحریروں میں بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے صرف قرآنِ کریم کافی ہے جس میں "عالمگیر ابدی ضابطہ حیات" ہے۔ اور جو اس قدر واضح اور صاف ہے کہ ہر مسلمان اسے سمجھ سکتا ہے۔ اگر یہ بات مسلم ہے تو ان بڑے بڑے ائمہ مثلاً امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام ابو یوسفؒ وغیرہم کی محنت شاقہ کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے جنہوں نے پوری عمر حدیث اور فقہ کی تدوین میں صرف کردی۔ اور اگر قرآن مجید اتنا ہی عام فہم اور واضح ہوتا تو اتنے اختلافات کیونکر رونما ہوئے۔ کیا ان ائمہ کو اس حقیقت کا علم نہ تھا اور

اگر ایسا تھا تو حدیث اور فقہ کے علم کی تدوین و تدریس اور اشاعت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اب تک آپ کی تحریروں پر کچھ جرح کی ہے جس کا مقصد مطالب کا حل اور میرے دل و دماغ کی تشفی ہے۔ آخر میں میں آپ کے مضمون "کیا اقبال اشتراکی تھا" کی تعریف کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں نہایت قابلیت سے لکھا گیا ہے۔"

طلوع اسلام: ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ان نکات کی وضاحت نہایت متانت اور سنجیدگی سے طلب فرمائی ہے۔ علمی اور فکری موضوعات کو زیر بحث لانے کا انداز اسی قسم کا ہونا چاہیئے۔ مختصراً جواب پیش خدمت ہے۔

پہلا سوال :- آئینِ فطرت میں یہ استثنا رہا ہے جسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی تشریح ۔۔۔ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۷۸ء کے باب المراسلات میں "ختم نبوت" کے عنوان کے تابع کی گئی ہے۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ انسانی علم کا ذریعہ یا طریق مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ، فکر و تدبر، فہم و فراست ہے۔ یہ ذریعہ علم اکتسابی اور ارتقائی ہے۔ اور جوں جوں انسان آگے بڑھتا آ رہا ہے اس کے علم کے افق وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن اس ذریعہ علم میں ایک استثنا وحی کی رو سے کی گئی تھی۔ وحی سے مراد یہ تھی کہ کسی منتخب ہستی کو ان ذرائع علم کے بغیر خدا کی طرف سے براہ راست حقائق کا علم دے دیا جاتا تھا اور وہ اس علم کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ ذریعہ علم ختم نبوت کے ساتھ ختم کر دیا گیا اور زندگی کے جن حقائق کا علم بذریعہ وحی دیا جانا مقصود تھا انہیں قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا۔ قرآنی راہنمائی ابدی ہے اور اس کے حقائق کو فہم و فراست اور غور و فکر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔

دوسرا سوال :- جب ہم نے کہا تھا کہ اس دور میں امت کے پاس ایک ہی کتاب تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے ہاں کسی قسم کی کوئی اور کتاب نہیں تھی۔ "کتاب" سے مراد ہے وہ ضابطۂ ہدایت جسے دین کے معاملات میں سند اور حجت سمجھا جائے۔ اس زمانے میں یہ حیثیت کتاب اللہ (قرآن کریم) کے علاوہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں تھی۔ امت میں تفرقہ اس وقت پیدا ہوا جب یہ حیثیت کتاب اللہ کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دے دی گئی اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کتاب اللہ محض تلاوت کے لئے باقی رہ گئی اور زندگی کے معاملات میں سند اور حجت اور چیزیں قرار پا گئیں۔

تیسرا سوال :- مسلمان شروع میں امت واحدہ تھے۔ بعد میں ان میں تفرقہ پیدا ہو گیا۔ متعین طور پر یہ تفرقہ کب شروع ہوا تھا یہ تاریخ کا سوال ہے اور تاریخ ایک ظنی ذریعۂ علم ہے (یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم تاریخ میں مذکور واقعات کو "حقائق" سمجھ لیتے ہیں) ہماری تاریخ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جا کر مرتب ہوئی اور وہ بھی بغیر کسی سابقہ تحریری یا اثری مواد کے۔ اس کا سارا مدار زبانی روایات پر تھا اور

دو تین سو سال کا عرصہ گذرنے کے بعد زبانی روایات پر جس قدر انحصار کیا جا سکتا ہے ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے معاملہ میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ "محمد رسول اللہ والذین معہ" کے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے اسے سند سمجھا جائے۔ جو تاریخی واقعات اس اصل کی تائید کریں انہیں صحیح تصور کر لیا جائے جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اُس دور کے بعد کی تاریخ، عام انسانوں کی تاریخ ہے (یعنی ان انسانوں کی جن کی سیرت و کردار کے متعلق قرآن نے کوئی شہادت نہیں دی) اس لئے اسے عام تاریخی معیار کے مطابق پرکھ لیا جائے۔ اس اصول کے مطابق "آنکھوں پر پٹی باندھنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے جن حضرات کو "مومن حقا" کہہ کر پکارا ہے اگر تاریخ میں ان کی طرف ایسے واقعات منسوب ہیں جو مومنینِ حقا کے شایانِ شان نہیں قرار پا سکتے، تو ہم تاریخ کے ایسے بیانات کو غلط قرار دینگے۔ ہمارا ایسا کرنا "آنکھوں پر پٹی باندھنے" کا نتیجہ نہیں ہوگا بلکہ اس امر کا نتیجہ ہوگا کہ قرآن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے اور اس ایمان کا تقاضا ہے کہ تاریخ کا ہر وہ بیان جو قرآنی صداقت کے خلاف ہو اسے غلط سمجھا جائے۔

(۲) آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہمیں دریافت کرنا چاہیئے کہ کیا اس تفرقہ کی ذمہ داری تمام تر انسانوں پر عاید ہوتی ہے"؟ آپ کے اس فقرہ سے آپ کا صحیح مطلب ہم پر واضح نہیں ہوا۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے (یاد رکھئے کہ ہم اس فقرہ کو "اگر" سے شروع کر رہے ہیں) خدا کرے کہ آپ کا مطلب یہ نہ ہو۔ لیکن اگر آپ کا مطلب یہ ہے) کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے پاس قرآن کریم موجود تھا اور یہی ایک کتاب سند و حجت سمجھی جاتی تھی اور مسلمانوں کا اس پر عمل بھی تھا تو اس کے باوجود اگر امت میں تفرقہ پیدا ہو گیا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ان مسلمانوں پر نہیں تھی (معاذ اللہ) اس کتاب پر تھی جس پر عمل کرنے سے یہ حالت پیدا ہو گئی۔

اگر آپ کا مطلب یہی ہے تو معاف فرمایئے یہ مفروضہ قرآن کریم کے دعویٰ کے خلاف جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں۔ سورۃ النساء میں ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ (۴/۸۲) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کیطرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔ اس کے اندر کوئی اختلافی بات نہیں اور اسے حکم قرار دینے سے اختلافات مٹ جاتے ہیں۔ سورۃ النحل میں ہے۔ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْہِ ۔ (۱۶/۶۴) ہم نے یہ کتاب تجھ پر نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو اس سے ان امور کو واضح طور پر سامنے لے آئے جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔ اسی لئے امت سے

کہا گیا۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ ۔ (۴۲/۱۰) زندگی کے جن معاملات میں بھی تمہیں اختلاف ہو، ان کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لے لیا کرو۔ اِن (اور اس قسم کی متعدد دیگر آیات) سے واضح ہے کہ اگر اختلافی معاملات میں سند و حجت خدا کی کتاب کو قرار دیا جائے اور اس کے فیصلوں کے مطابق عمل کیا جائے تو امت میں اختلاف پیدا ہو نہیں سکتا۔ ایسا ہونا قرآن کے دعاوی کے خلاف ہے۔ ہم پھر دہرا دیں کہ امت میں وحدت کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) امت کا ایک نظام ہو۔

(۲) اس نظام کی ایک مرکزی اقتدار کی ہو۔ اور

(۳) ہر معاملہ میں سند و حجت اور حَکَم اور قولِ فیصل خدا کی کتاب ہو۔

امت میں جہاں تفرقہ نظر آئے، سمجھ لینا چاہیئے کہ ان ارکان میں سے کوئی ایک رکن (یا سب کے سب ارکان) باقی نہیں رہے تھے۔ اور اس تفرقہ کی ذمہ داری انسانوں پر عاید ہوگی۔ قرآن کریم پر نہیں۔

چوتھا سوال:۔ قرآنِ کریم ہمارے پاس آج بھی موجود ہے۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ

(۱) یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۔ (۶/۱۱۵)

(۲) یہ ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۔ (۶/۱۱۵)

(۳) یہ اپنی ہر بات نہایت وضاحت سے بیان کر دیتا ہے۔ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹)

یہ خود قرآن کا بیان ہے، ہمارے وضع کردہ دعاوی نہیں ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر قرآن کی تعلیم اتنی واضح تھی تو ہمارے ائمہ کرام نے فقہ و روایات کی تدوین میں اس قدر کوشش کیوں کی۔ سو واضح رہے کہ فقہ اور روایات کی ایک الگ حیثیت ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ ان حضرات کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ قرآن ناقص ہے، ہم اس کی تکمیل کر رہے ہیں یا وہ مبہم ہے، ہم اسے ناطق بنا رہے ہیں۔ لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ نہیں! انہوں نے یہ کچھ اس لئے کیا تھا کہ ان کے نزدیک قرآنی تعلیم مبہم اور ناتمام تھی، تو اس صورت میں ہم وہی کہیں گے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ (۲/۱۳۴) یہ گروہ دنیا سے چلا گیا۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ ہیں، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا) لہٰذا جب ہم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا اور ایسا کیوں کیا تھا، تو ہم خواہ مخواہ اس بحث میں کیوں الجھیں۔ ہم سے ہمارے اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا اس لئے ہمیں یہی دیکھنا چاہیئے کہ

ہمارا قدم، قرآنِ کریم سے اِدھر اُدھر دہٹ جاتے۔ دو واضح ہے کہ اپنے اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق قرآنی حقائق کی تشریح کرنا اور بات ہے اور اس کی تعلیم کو مبہم اور نامکمل قرار دینا اور اسے واضح اور مکمل کرنے کی کوشش کرنا اور بات۔

آخر میں آپ نے بات ذرا کھل کر کہہ دی ہے یعنی یہ کہ "اگر قرآن اتنا ہی واضح اور عام فہم ہوتا، تو اتنے اختلافات کیوں رونما ہوتے" یعنی آپ کے نزدیک امت میں اختلافات اس لئے رونما ہوئے کہ قرآن کی تعلیم واضح نہیں تھی۔ لہذا اس کی ذمہ داری انسانوں پر نہیں بلکہ خود قرآن پر عاید ہوتی ہے۔

ہم نے قرآنِ کریم کا دعوےٰ اوپر پیش کر دیا ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی یہ کہتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیم واضح نہیں، اور اسی کی وجہ سے امت میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں، تو ایسا کہنے والے کا اگر قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان ہے تو اسے خود سوچ لینا چاہیئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! اُسے ہم سے نہیں، (کہ یہ کتاب ہماری تصنیف کردہ نہیں، بلکہ) خدا سے پوچھنا چاہیئے (جس کی یہ کتاب اور آخری کتاب ہے) کہ اس نے ایسی کتاب کیوں بھیجی، اور اس پر ایمان لانے کو کیوں کہا، جس کی کوئی بات صاف اور واضح نہیں اور جس سے انسانوں میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔

آخر میں ہم اتنا اور عرض کر دیں کہ اگر (آپ کے بیان کے مطابق) امت میں اختلافات اس لئے پیدا ہوئے کہ قرآن کی تعلیم غیر واضح تھی۔ اور ائمہ کرام نے اس کی وضاحت کی کوشش کی، تو سوال یہ ہے کہ کیا ائمہ کرام کی ان کوششوں سے امت کے اختلافات مٹ گئے یا اور زیادہ ہو گئے؟

ہمارے محترم! امت میں اختلافات اس لئے پیدا ہوئے کہ

(۱) ان میں ایک نظام اور ایک مرکزی اتھارٹی نہ رہی۔ اور

(۲) معاملات کے تصفیہ کے لئے خارج از قرآن چیزوں کو سند اور حجت سمجھ لیا گیا۔

اختلافات قرآن سے پیدا نہیں ہوتے۔ قرآن کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۲۲)

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار کی صبح ۸½ بجے ۲۵/بی گلبرگ لاہور میں ہوتا ہے۔ خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہوتا ہے

ناظم

حقائق و عبر

الیکشن کی برکات

مودودی صاحب نے کبھی خود تو ایسا نہیں کہا (اور وہ ایسی باتیں جن پر گرفت کا اندیشہ ہو اپنے قلم اور زبان سے کہاں کبھی نہیں کرتے۔ جس کے پاس سینکڑوں زرخرید قلم اور مملوک زبانیں ہوں وہ ایسی باتیں براہِ راست خود کیوں کہے) لیکن کچھ عرصہ سے ان کے حاشیہ برداروں نے یہ مشہور کرنا شروع کر رکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں کسی ایسے صاحبِ بصیرت مردِ راہ داں کی تلاش تھی جس کے سپرد وہ اپنا وہ کام کر سکیں جسے وہ کرنا چاہتے تھے لیکن کر نہیں پائے تھے۔ اس مقصد کے لئے ان کی نگاہِ انتخاب مودودی صاحب پر پڑی۔ چنانچہ انہوں نے انہیں خاص طور پر حیدر آباد (دکن) سے بلوایا۔ (یعنی انہوں نے ان سے درخواست کی اور انہوں نے اس درخواست کو شرفِ پذیرائی عطا فرمایا۔) اور یہ شمع ان کے ہاتھ میں دیکر یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کہ

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

لیکن جب سے جماعتِ اسلامی کے حلقہ میں اس کا چرچا شروع ہوا، اہلِ پاکستان حیران تھے کہ مودودی صاحب ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد (دکن) سے پنجاب آئے۔ دس سال کا عرصہ قبل از تقسیم، اور تیئیس سال کا عرصہ اس کے بعد۔ــــ اس تمام عرصہ میں کسی نے نہ ان کی زبان سے کبھی اقبال کا نام سنا، نہ ان کی تحریروں میں ان کا ذکر آیا۔ حتّٰے کہ ان کی تصانیف یا ترجمان القرآن میں کبھی بھولے سے بھی اقبالؒ کا کوئی شعر درج نہ ہوا۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے انہوں نے ایک مرتبہ (۱۹۳۹ء میں) اقبالؒ ڈے میں شرکت کی تھی اور اس میں دو قومی نظریہ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس کے بعد ملک میں اقبال کی یاد میں ہر سال سینکڑوں تقاریب منعقد ہوتی رہیں۔ مودودی صاحب نے ان میں سے کسی میں بھی قدم رنجہ فرمانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ لیکن اس دفعہ

اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی ہال (لاہور) میں منعقدہ اقبال ڈے میں تشریف فرما ہیں اور ایسی معذوری کی حالت میں جس کا ذکر انہوں نے اپنی تقریر کے افتتاحیہ میں ان الفاظ میں فرمایا کہ

> میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں کہ بیٹھ کر تقریر کر رہا ہوں۔ دراصل میری صحت آجکل اتنی خراب ہے کہ کھڑے ہو کر تقریر کرنا تو درکنار بیٹھ کر تقریر کرنا بھی میرے لئے دشوار ہے۔ میں صرف اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا جو موقع مل رہا ہے اس سے محروم نہ رہ جاؤں۔

اللہ اللہ! کتنی گہری عقیدت ہے انہیں حضرت علامہ اقبال سے! یہ صاحب لندن اور مراکش تک تو ہو آئے لیکن پیٹھان کوٹ اور لاہور میں رہتے ہوئے گذشتہ تیس سال میں انہیں اقبال سے متعلق کسی تقریب میں شرکت کا موقع (اس سے پہلے) کبھی نہ مل سکا۔

انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

> واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال کے عرصہ میں اسلامی جذبے، اسلامی شعور، اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کے احساس کو مسلمانوں میں قائم رکھنے کے لئے اگر کوئی قیادت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبالؒ کی ذات تھی۔

اس کے بعد کہا۔

> اس نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ قومیت، وطن پر نہیں، دین اور عقیدے پر مبنی ہے۔ تمہاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جو تمہارے ساتھ عقیدے کا اختلاف رکھتے ہیں۔

اور یہ کہ

> اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔

اور پھر یہ کہ

> اقبال نے آپ کو نظریہ دیا اور قائد اعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔ (ایشیا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء)

ظاہر ہے کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا ۱۹۳۸ء سے پہلے کہا (اپریل ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات ہو گئی تھی)۔ اور مودودی صاحب نے ۱۹۳۹ء سے اپنی تالیف مسلمان اور سیاسی کشمکش (حصہ سوم) کے مقالات کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں انہوں نے بصراحت کہا کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

اور یہ کہ

> لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔

حتیٰ کہ

> ان کے خیالات، نظریات، اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔

اور یہ کسے معلوم نہیں کہ علامہ اقبالؒ نہ صرف مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھے بلکہ وہ پنجاب کی صوبائی لیگ کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ مودودی صاحب کی ان تنقیدات میں اقبالؒ کی بھی کہیں استثنا نہیں کی گئی۔ اور کسی ایک جگہ اتنا کہنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ انہوں نے البتہ صحیح اسلامی نظریہ پیش کیا تھا۔

اور اب، تیس سال کے بعد، اقبالؒ اور اس کی اسلامیت کے گیت گاتے جا رہے ہیں۔ کہیئے کہ آپ الیکشن کی کس کس برکت کا انکار کریں گے۔

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپے پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائیں گے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیجدی جائے گی۔ رسالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیج دیا جائیگا۔

(ناظم)

شاہد عادل

عورتوں کے اسلامی حقوق اور نابالغ لڑکیوں کی شادی

موجودہ سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہماری بہنوں کو جن "اسلامی حقوق" کے سبز باغ دکھلائے جا رہے ہیں، قارئین اس کی جھلک طلوعِ اسلام کے پچھلے شمارہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ فرمایا یہ جا رہا ہے کہ ملک میں جو عائلی قوانین نافذ ہیں وہ سراسر غیر اسلامی ہیں جبکہ اسلام عورتوں کو اس سے زیادہ عمدہ اور اعلےٰ حقوق عطا کرتا ہے۔ اس لئے جمہوریت کی بحالی کے بعد "اسلام پسند" سیاست دان جو سب سے پہلا کارنامہ سرانجام دیں گے، وہ عائلی قوانین کی منسوخی ہوگا۔ پچھلے شمارے میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کس طرح عائلی قوانین کی منسوخی کے بعد ہماری بہنوں کو ایک دفعہ پھر حلالہ جیسی شرمناک لعنت کا شکار ہونا پڑے گا۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ حضرات کس طرح قوم کی نابالغ معصوم بچیوں کو اپنی سیاست کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھائیں گے۔

صغر سنی کی شادی اور اس پر پابندی کا مطالبہ

ہمارے ملک میں عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے اس قسم کے جھگڑے عام طور پر سننے جاتے تھے کہ فلاں بچی کا نکاح پانچ سال کی عمر میں کر دیا گیا۔ لیکن جب لڑکی نے ہوش سنبھالا تو وہ اس رشتے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح ان لڑکوں کا معاملہ تھا جن کی شادی بلوغت سے پہلے کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ اکثر و بیشتر یہ معاملات عدالتوں میں جاتے اور پھر بھلے وکیل حضرات ایسی ایسی بال کی کھال نکالتے جس سے دونوں فریقوں کی خوب خوب فضیحتی ہوتی اور انہیں سخت بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعض اوقات فریقین اس بے عزتی کو محسوس کر لیتے تو یہ چیز دونوں خاندانوں میں دائمی دشمنی کا سبب بن جاتی۔ یہاں تک کہ نتیجہ خون خرابے کی صورت میں نکلتا۔ ہمارے معاشرے میں یہ واقعات اس کثرت سے ہونے لگے کہ

علماء حضرات تک بھی زیادہ دیر تک اس برائی سے آنکھیں بند نہ رکھ سکے اور اسے ختم کرنے کے لئے انہوں نے بھی نابالغ لڑکوں لڑکیوں کی شادیوں پر پابندی لگانے کا یوں مطالبہ کیا۔

"اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے۔ کیوں کہ اکثر لڑکے جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی رہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

(حقوق الزوجین۔ طبع ششم صفحہ 119)

مصر میں عائلی قوانین کا نفاذ

ان الفاظ کے فرمانے والے جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان ہیں۔ آپ نے یہ مطالبہ آج سے تیس چالیس سال پہلے کیا تھا جب ان کی علمی زندگی ہنوز سیاست سے ملوث نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مصر میں تازہ عائلی قوانین نافذ ہوتے تھے جن میں عائلی زندگی کی خرابیوں کے خلاف قانون سازی کی گئی تھی۔ مودودی صاحب نے بھی ان قوانین سے متاثر ہو کر بالکل اسی مواد پر اپنی کتاب حقوق الزوجین تصنیف فرمائی تھی اور اس کتاب میں مصری عائلی قوانین کی یوں تعریف فرمائی تھی۔

مصر میں جب (MIXED TRIBUNALS) قائم کئے گئے تھے تو وہاں بھی ایک ایسے مجموعہ قوانین کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جن میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ حکومت مصر کے ایماء سے قدری پاشا کی صدارت میں علمائے ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا اور مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا ہے۔ (ایضاً صفحہ 9)

مصری عائلی قوانین کی یہ تعریف صرف مودودی صاحب تک محدود نہ تھی بلکہ اس وقت جماعت کے ہر قابل ذکر اہل قلم نے اس کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ قیام پاکستان کے بعد عائلی قوانین کے نفاذ سے کچھ عرصہ پہلے جماعت اسلامی کی اس وقت کی شخصیت نمبر ۲ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ان قوانین کے بارے میں یوں فرمایا۔

"آخر میں ایک کمیٹی مراغی مرحوم کی صدارت میں قائم ہوئی تھی جس کے ارکان میں مفتی شیخ عبدالمجید سلیم اور مصر کے چیف جسٹس فتح اللہ سلیمان بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لاز سے متعلق قوانین نئے طریقے پر مرتب کرائے

اور اس میں کسی ایک متعین فقہ کی تقلید کے بجائے اسلام کے تمام فقہی مذاہب سے فائدہ اٹھائے۔ یہ کمیٹی ہمارے نزدیک صحیح اصول پر ایک صحیح مقصد کے لئے بنائی گئی تھی۔"

(ماہنامہ چراغِ راہ۔ کراچی۔ اسلامی قانون نمبر جلد دوم صفحہ ۴۹۶ ۳۲)

مختصر یہ کہ مصری عائلی قوانین پر کوئی معمولی سا اعتراض کرنا تو کجا ان حضرات نے ہر لحاظ سے انہیں سراہا، اور انہی کی بنیاد پر اپنی کتاب "حقوق الزوجین" تصنیف فرمائی۔ ہمارے ملک میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے، وہ بھی کم و بیش مصری قوانین سے ملتے جلتے تھے۔ اس لئے اگر ان قوانین اور "حقوق الزوجین" کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو الفاظ و اصطلاحات کا۔ روح ایک ہے۔

صغرِ سنی کی شادی کیخلاف مصری قانون

صغرِ سنی کی شادیوں سے پیدا ہونے والی قباحتوں کے بارے میں ہم مودودی صاحب کی رائے ابتدا میں نقل کر آئے ہیں۔ مصر میں ان خرابیوں کو ہم سے بھی پہلے محسوس کیا گیا تھا۔ قرآنی احکام یعنی یہ کہ شادی فریقین کے درمیان ایک پختہ معاہدہ ہے (میثاقاً غلیظاً۔ النساء۔ ۲۱) کو سامنے رکھا جائے تو اس پختہ معاہدے کے لئے بلوغت ایک لازمی شرط قرار پاتی ہے۔ اس بارے میں قرآنی احکام ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن قدامت پسند علماء کے اعتراض سے بچنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صغرسنی کی شادی پر پابندی کے لئے فقہ سے بھی استدلال کیا جائے۔ یہ مسئلہ ہمارے ارباب مذاہب ائمہ فقہ کے نزدیک اختلافی تھا۔ چنانچہ حکومتِ مصر نے سلف صالحین میں سے امام ابن شبرمہ کے مسلک کو اختیار کرکے شادی کے لئے لڑکی کی عمر سولہ سال اور لڑکے کے لئے اٹھارہ سال مقرر کر دی۔ (مصری قانون نمبر ۵۶۔ مورخہ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ)

امام ابن شبرمہ نے صغرسنی کی شادی کے خلاف یہ استدلال قرآن مجید ہی سے کیا تھا۔ حنفی فقہ کے ایک امام علامہ سرخسی سلف صالحین کے اس مسلک کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

یقولہ ابن شبرمۃ و ابوبکر الاصم انہ لا یزوّج الصغیر والصغیرۃ حتّیٰ یبلغا لقولہ تعالیٰ حتّیٰ اذا بلغوا النکاح فلوجاز التزویج قبل البلوغ لم یکن لھذا فائدۃ"۔ (المبسوط جلد ۴ صفحہ ۱۹۳)

امام ابن شبرمہ اور ابوبکر اصم نے نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کی شادی کی مخالفت کی ہے۔ ان کی دلیل یہ قولِ باری تعالیٰ ہے۔ حتّیٰ اذا بلغوا النکاح۔ اگر بلوغت سے پہلے نکاح جائز ہوتا تو یہ آیت بے سود تھی۔

(٭٭)

برصغیر میں عائلی قوانین کی ضرورت

اب آپ ایک بار پھر مودودی صاحب کے مصلحتی اسلام کیطرف آیئے۔ عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے مسلمانوں میں جو احکام شریعت اس باب میں نافذ تھے، ان سے جو نتائج پیدا ہو رہے تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا تھا۔

> اس افسوسناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں ان میں سب سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ اس نے کم از کم ۵۰ فیصدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کی زندگیاں تلخ بلکہ برباد کر دی ہیں۔
>
> (حقوق الزوجین۔ صفحہ ۹)

چنانچہ زمانے کے تقاضوں نے مجبور کیا اور حکومت پاکستان کی طرف سے عائلی قوانین کا نفاذ ہوا جن میں بیشتر وہی اصلاحات عمل میں لائی گئیں جو عرصہ پہلے مصر میں رائج ہو چکی تھیں اور جن کا مودودی صاحب نے اپنی کتاب حقوق الزوجین میں مطالبہ کیا تھا۔ انہی میں سے ایک قانون شادی کی عمر کا تعین ہے جو شاید مصری قوانین کے تتبع میں امام ابن شبرمہ کے مسلک کے مطابق اختیار کیا گیا جس میں شادی کے لئے لڑکی کی عمر سولہ سال اور لڑکے کے لئے اٹھارہ سال مقرر کی گئی۔

قوم کی معصوم بچیاں سیاست کی قربانگاہ پر

لیکن دنیا یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ جن اصلاحات کا مطالبہ اس سے پہلے یہ حضرات خود کیا کرتے تھے جب وہ اصلاحات حکومت کی طرف سے نافذ ہوئیں تو انہوں نے ان کی سخت مخالفت کی حتیٰ کہ انہیں قرآن کے خلاف قرار دے دیا۔ چنانچہ شادی کے لئے بلوغت کی شرط کے متعلق ارشاد ہوا کہ

> یہ قرآن کے صریح حکم کے خلاف اور ان مصالح سے متصادم ہے جنہیں اسلامی شریعت نے اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں بالفاظ صریح ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے جس کو ابھی حیض نہ آیا ہو۔ سورۃ طلاق کی آیت ۴ میں بتایا گیا ہے کہ جن عورتوں کا حیض آنا بند ہو چکا ہو یا جن عورتوں کو ابھی حیض آنا نہ شروع ہوا ہو انکے معاملے میں عدت طلاق تین مہینے ہے[1]۔ اب یہ ظاہر ہے کہ عدت طلاق کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ اس طرح قرآن مجید صریح طور پر اس لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیتا ہے جس کو حیض آنا نہ شروع ہوا ہو۔ ہمارے ملک میں بالعموم لڑکیوں

---

[1] طلوعِ اسلام میں اس غلط استدلال کا ابطال اس سے بیشتر کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے (طلوعِ اسلام)

کو ۱۳ برس کے لگ بھگ عمر میں حیض آنا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے
اس سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ نکاح جائز ہے۔"

(عائلی قوانین پر چودہ علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۹۔۲۰)

صغر سنی کی شادی کی قباحتوں اور اس پر پابندی لگانے کے بارے میں مودودی صاحب کے ان ارشادات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جو ہم اس مضمون کی ابتدا میں نقل کر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "حقوق الزوجین" میں جہاں صغر سنی کی شادیوں پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا وہاں کہیں اس امر کی طرف اشارہ تک بھی نہیں ملتا کہ یہ پابندی قرآنِ مجید سے متصادم ہے۔ لیکن جونہی حکومتِ پاکستان نے یہ پابندی لگائی، فوراً قرآن مجید سے اس کا تصادم ہو گیا۔ خیال رہے کہ ان حضرات نے جہاں عائلی قوانین کے دوسرے معاملات میں بار بار فقہ کا حوالہ دیا ہے اس کا یہاں اسلئے نام نہیں لیا کہ اس کے مطابق یہ ایک اختلافی مسئلہ قرار پاتا ہے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق دوسرے مذہب کے امام کا مسلک بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

کیا یہ پابندی قرآن سے متصادم ہے؟

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ حضرات جو شادی کے لئے بلوغت کی عمر کو لازم قرار دینے کو قرآن سے متصادم قرار دے رہے ہیں تو کیا یہ واقعی ایسا ہے؟ سب سے پہلے تو اسی آیت کو لیجئے جس سے اب یہ حضرات نابالغ بچیوں کا نکاح ثابت کر رہے ہیں۔ (وَ اللَّٰٓئِی لَمْ یَحِضْنَ)۔ اردو میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ان سب میں اس آیت کا ترجمہ کم و بیش ان الفاظ میں دیا گیا ہے "کہ جن عورتوں کو حیض نہ آسکا ہو" اور جہاں تک میرا مطالعہ میری رہنمائی کرتا ہے کسی قدیم ترجمے میں یہ نہیں لکھا کہ جن عورتوں کو حیض آنا شروع نہ ہوا ہو۔ آیت کو یہ معانی عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد پہنائے جا رہے ہیں۔ اسلامی فقہ کی معتبر کتابوں میں امام ابن شبرمۃ کا مسلک دیا ہوا ہے اور امت کے لاکھوں علماء میں سے کسی نے اسے قرآن سے متصادم نہ کہا، بلکہ امام ابن شبرمۃ نے تو استدلال ہی قرآن مجید سے کیا تھا۔ خیال رہے کہ امام ابن شبرمۃ تابعی تھے اور کئی صحابہ کرامؓ سے بالمشافہ روایت کی تھی۔ یہاں تک کہ طبرانی نے اپنی کتاب اوسط میں عبدالوارث کی زبانی جو روایت نقل کی ہے اس کے مطابق معاصر فقہاء امام ابن شبرمۃ کو امام ابوحنیفہؒ پر فوقیت دیتے تھے۔

اب آپ قرآن مجید کیطرف آیئے۔

(۱) قرآن حکیم نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (۴/۲۱) یعنی سخت معاہدہ قرار دیا ہے اور معاہدہ کے لئے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں۔

(۲) قرآن حکیم نے بلوغت ہی کو نکاح کی عمر قرار دیا ہے۔ وابتلوا الیتٰمٰی حتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ (۴/۶)

(یتیموں کے سرپرست ہو تو مال ان کے حوالے کرنے کے لئے) ان کو آزماتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔

تمام فقہاء و ائمہ تفسیر اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں نکاح کی عمر سے بلوغ مراد ہے۔ یعنی یتیموں کو اس وقت ان کا مال دینا چاہیئے جب وہ بالغ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم بلوغ کو ہی نکاح کی عمر قرار دیتا ہے۔

نکاح کے لئے باہمی رضامندی

قرآن مجید کی رُو سے نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ارشاد ہے۔ فانکحوا ما طاب لکم من النسآء۔ (تو ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں)۔ اور عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا۔ (تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔) لہٰذا جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں وہ نکاح قرآن کی رُو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

اتنی واضح قرآنی تعلیمات کے باوجود ان حضرات کو نکاح کے لئے بلوغت کی شرط قرآن مجید سے متصادم نظر آتی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی شادی کی عمر

اس موضوع پر ان واضح قرآنی احکامات کے بعد حدیث و فقہ سے اگر صغر سنی کی شادی کی اجازت ملتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ اباحت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے فرض یا واجب نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے اگر کسی مباح فعل سے فتنے پیدا ہو رہے ہوں (اور اس مسئلہ میں تو خود علماء کو بھی تسلیم ہے) تو اس کے مقابلے میں دوسرے امام فقہ کا مسلک اختیار کیا جا سکتا ہے جو زمانے کے تقاضوں کے زیادہ مطابق ہو۔ لیکن اس بارے میں احادیث سے جو واقعہ پیش کیا جاتا ہے تاریخی لحاظ سے وہ واقعہ ہی سرے سے محل نظر ہے۔ یہ واقعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی شادی کی عمر کے متعلق ہے کہ آپ کی شادی ۹ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو یہ واقعہ ہی سرے سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کی بڑی (علاتی) بہن تھیں۔ ان کے متعلق صاحب مشکوٰۃ علامہ شیخ ولی الدین ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب اپنی مستند کتاب "الکمال فی اسماء الرجال" میں لکھتے ہیں۔

> یہ اسماء ہیں ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی۔ ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے جس رات حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی، اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے۔ اس کے ایک حصے میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزہ پر باندھا یا اس کا پٹکا بنا لیا تھا۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ہیں۔ مکہ میں اسلام لائیں کیا

جاتا ہے کہ اس وقت صرف سترہ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں۔ .... ایک سو سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس وقت ۷۳ھ تھا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں"۔

(اکمال فی اسماء الرجال)[۱]

وفات کے وقت یعنی ۷۳ھ میں ان کی عمر سو سال تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہجرت کے وقت اُن کی عمر ۲۷ سال کی تھی۔ حضرت عائشہؓ ان سے دس برس چھوٹی تھیں۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ سال بنتی ہے۔ شادی ۲ھ میں ہوئی تھی اس لئے شادی کے وقت آپ کی عمر انیس سال کی ہوئی۔

یہ ہے صغر سنی کی شرعی حیثیت۔ ہماری بہنیں جواب ماشاء اللہ کافی حد تک بیدار ہو چکی ہیں، ان حضرات سے پوچھنے کا حق رکھتی ہیں کہ نابالغ بچیوں کے شادی کے بارے ان کا کون سا مسلک اسلامی ہے؛ وہ جو حقوق الزوجین میں درج ہے یا وہ جو انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد اختیار کیا ہے۔ ووٹ دینے سے پہلے ان سے یہ وضاحت کرانی بڑی ضروری ہے۔

---

[۱] طلوع اسلام میں اس موضوع پر بھی تفصیلی طور پر لکھا جا چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

بقیہ نقد و نظر (مسلسل از صفحہ ۷۹)

نے مصنف کو بھی ایک بیٹی عطا کی تو اس کا قلم "طاہرہ" جیسے ناول کا تانا بانا بننے میں لگ گیا۔ وہ بیٹی کا ہر روپ دکھاتا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز سے گزار کر دکھاتا ہے کہ بیٹی کن حیران کن صلاحیتوں کی امین ہے، اور موقعہ ملنے پر کیا کچھ کر گذرنے کی اہل ہے۔ بیٹی کو ازلی مظلوم اور بیچارہ سمجھنے والے ذہن شاید بیٹی کے اس کردار پر حیران ہوں لیکن معاشرے میں عورت کے کردار کو کم حق سمجھنے والے اس سے بہتر اور متنوع کردار کو بھی خارج از بحث نہیں سمجھیں گے۔ عنایت اللہ نے بیٹی کی عظمت کردار کو ہی اجاگر نہیں کیا ہے بلکہ روزمرہ کی زندگی میں طرح طرح کی رائی کا پہاڑ بن جانے والی باتوں کا تجزیہ کر کے ان کو قابلِ فہم اور قابلِ حل بنا دیا ہے۔ ناول کے کردار معاشرے کے چلتے پھرتے کردار ہیں اور فضا پاکستانی ہے۔ ناول نفسیاتی مطالعہ بھی ہے اور معاشرتی بھی۔ بازار میں ایسے ناولوں کی کمی نہیں جو معاشرتی اور نفسیاتی ہونے کے دعویدار ہیں لیکن "طاہرہ" ان سے مختلف اور منفرد قسم کا ناول ہے۔ کتابت و طباعت میں ناشرین نے عمدگی ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اس اعتبار سے ۴۸۸ صفحات کی اس مجلد کتاب کی قیمت پندرہ روپے زیادہ نہیں۔

نقد و نظر

"طاہرہ" (ناول)۔ مصنف: عنایت اللہ۔ ناشر: محمد طفیل (مدیر نقوش)۔ ملنے کے پتے: (۱) ادارہ فروغِ اردو، ایبک روڈ، لاہور۔ (۲) التحریر، کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۳۴۵۔ قیمت: ۱۵/- روپے

عنایت اللہ اور جنگِ ستمبر ایسے لازم و ملزوم ہو گئے ہیں کہ عنایت اللہ کا نام آتے ہی پاکستان کے شہیدوں اور مجاہدوں کے ایمان افروز کارناموں کا دفتر کھلا دکھائی دینے لگتا ہے۔ عنایت اللہ نے ان کارناموں کو جس خلوص، محنت اور عقیدت سے مرتب کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس داستانِ جہاد کی تکمیل ایک عنایت اللہ کے بس کی بات نہیں لیکن ہماری دعا ہے کہ اللہ انہیں توفیق دے کہ اس داستان کی زیادہ سے زیادہ کڑیاں تلاش اور محفوظ کر سکیں۔

زیرِ تبصرہ ناول عنایت اللہ کی ایسی تصنیف ہے جس میں جنگِ ستمبر کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ مصنف کی کوتاہی یا فروگذاشت نہیں بلکہ یہ تصنیف جنگ سے پہلے کی ہے جو ان دنوں مکتبۂ التحریر، اردو بازار، لاہور نے بڑے سلیقے سے شائع کی ہے۔ اس میں جنگِ ستمبر کا ذکر نہیں تو دو ایسی جنگوں کا ذکر ہے جو ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی کے لئے بڑی اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ ایک جنگ تحریکِ پاکستان ہے جو کامیابی سے لڑی نہ گئی ہوتی تو ہماری ملّی تاریخ جنگِ ستمبر کے روح پرور کارناموں سے یکسر محروم رہتی۔ یہ جنگ عنایت اللہ کے سامنے لڑی گئی اور اس نے اس میں مقدور بھر حصہ بھی لیا۔ اسی لئے اس نے تحریک کا جو منظر ناول میں پیش کیا ہے وہ تخیل کی خلاقی نہیں بلکہ حقیقت کا واضح مگر اثر انگیز بیان ہے۔ پاکستان بنانے کے لئے مسلمانوں نے جو جدوجہد کی اور پاکستان تک پہنچنے کے لئے انہیں جن غیر انسانی مظالم سے دوچار ہونا پڑا اُسے کہانی کے پیرائے میں عنایت اللہ نے دل سوزی سے پیش کیا ہے۔

ایک اور پہلو سے یہ ناول کہیں زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ یہ پہلو اس دوسری جنگ نے پیدا کیا ہے جو طاہرہ بیٹی معاشرہ میں لڑ رہی ہے۔ بیٹی اس معاشرے میں بڑی مظلوم ہے۔ وہ بے گناہ قتل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ جانے یہ ظلم کب تک ہوتا چلا جائے گا۔ مصنف کا حساس ذہن ۱۹۵۵ء میں پاکستان ہی کے ایک علاقے سے آنے والی اس خبر سے لرز اٹھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اس لئے قتل کر دیا کہ اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ انہی دنوں قدرت

(باقی صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ)

دونوں طرح فائدہ ہی فائدہ

پریمیئم کم دیجئے

بونس زیادہ لیجئے

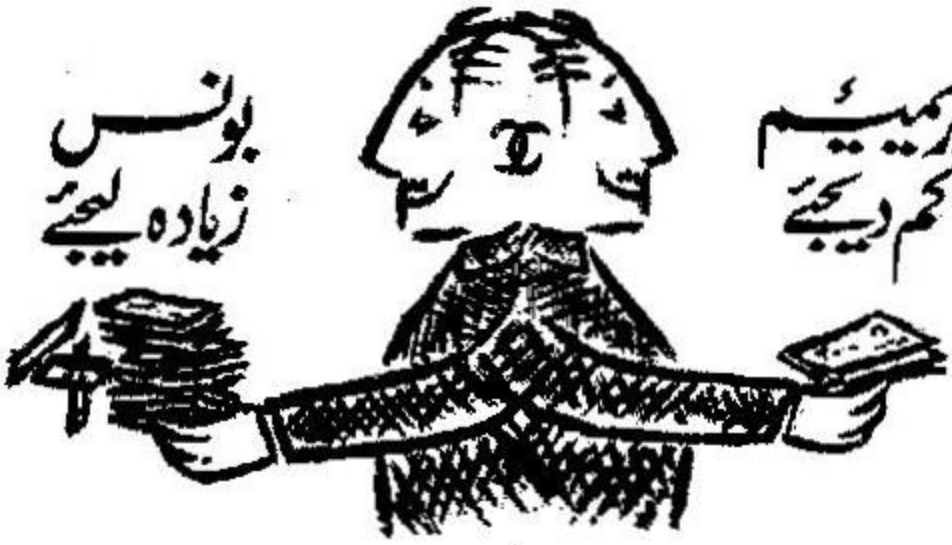

بیمہ شدہ رقم کے ہر ہزار روپے پر

پریمیئم

۲۵ سال کی عمر میں لی گئی
۳۰ سالہ پالیسی پر
جین حیات پالیسی پر ۲۶ روپے ۸۰ پیسے سالانہ
میعادی پالیسی پر ۳۱ روپے سالانہ

بونس

برائے ۶۹-۱۹۶۸ء

جین حیات پالیسی پر ۴۲ روپے
میعادی پالیسی پر ۳۳ روپے

۳۰ جون ۱۹۷۰ء سے پہلے
پوسٹل لائف انشورنس سے بیمہ کرائیے
اور انکم ٹیکس بھی بچائیے

پوسٹل لائف انشورنس